البلاغ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

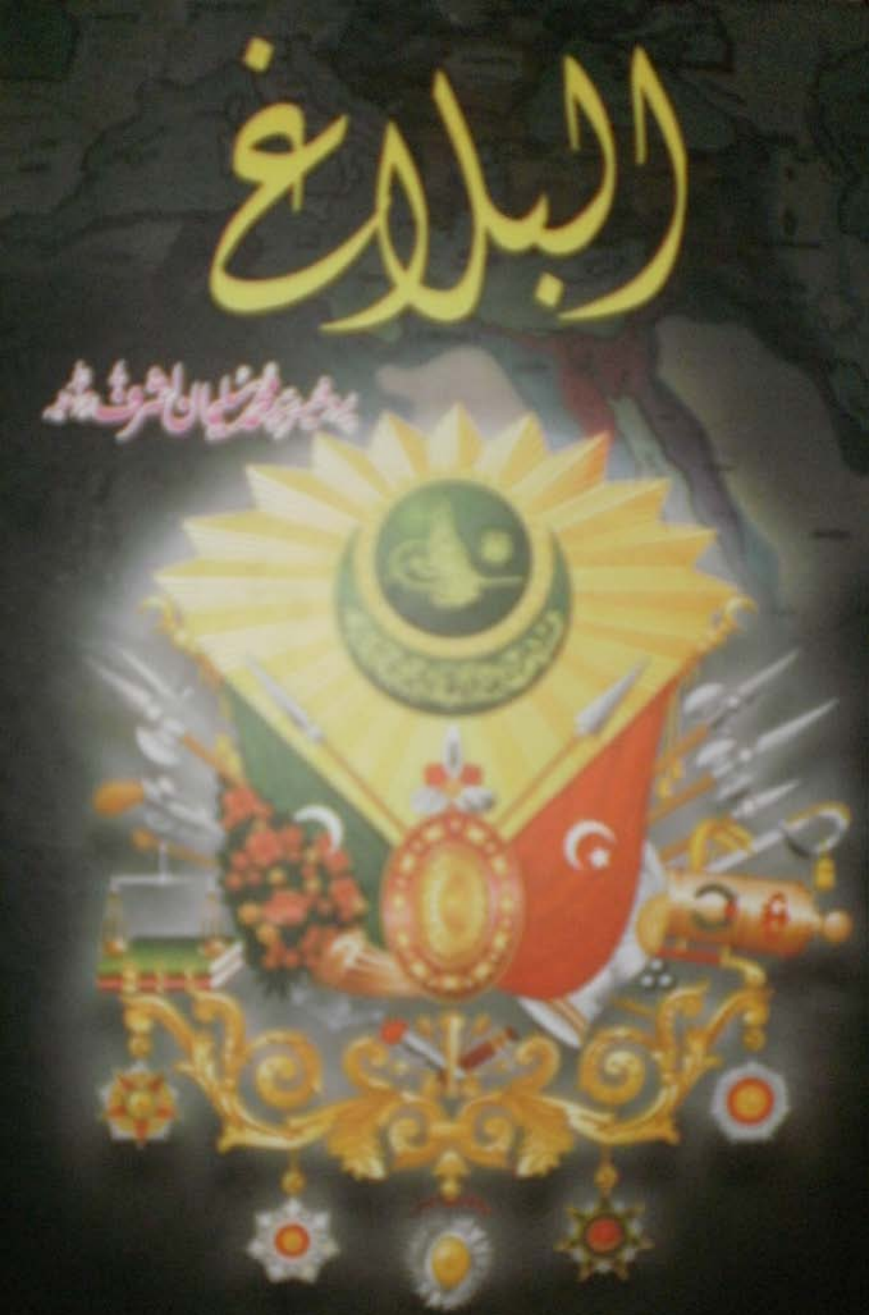

مسلمانوں کے ملی انحطاط، بے عملی، بے تنظیمی اور خلافت عثمانیہ کے
تاریخی واقعات کے تناظر میں ملت کے لیے ایک جامع اور بصیرت افروز

کتاب : (۱) البلاغ (۲) اسلام اور خلافت
تالیف : پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف
پہلا ایڈیشن : ۱۹۹۱ء
طبع جدید : رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ / ستمبر ۲۰۱۰ء
(مع مقدمہ و حواشی)
ضخامت : ۱۳۲ صفحات
تعداد : گیارہ سو
مطبع : حاجی حنیف اینڈ سنز، لاہور
ناشر : ادارۂ پاکستان شناسی، ۳۰۴/۳ سوا میل کالونی، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۰۰
فون ۰۳۲۲-۴۰۰۵۹۵۲، ۰۴۲-۳۷۵۱۳۸۶۲
قیمت : ۱۵۰ (ایک صد پچاس روپے)

ڈسٹری بیوٹرز

خان بک کلب، ۳۰-کورٹ اسٹریٹ، لوئر مال، لاہور فون ۰۴۲-۳۷۳۵۲۶۳
اورینٹل پبلی کیشنز، ۳۵۰-ریل پارک، لاہور فون ۰۴۲-۳۶۳۶۳۰۰۹
نگین بکس، گلگشت، ملتان فون ۰۶۱-۶۵۲۰۷۹۰، ۶۵۲۰۷۹۱
دار العلوم نعیمیہ، فیڈرل بی ایریا، گلبرگ بلاک نمبر ۱۵، کراچی فون ۰۲۱-۳۶۳۲۲۳۳۰

کی خدائی وحدانیت سے انسانیت کے عام رشتوں کے بعد بھی یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ آپ کی ہر حد انسانی کا کوئی حصہ عربی، ایرانی، افغانی، ہندی یا امریکی آزادیت میں جذب ہو سکتا ہے۔ لیکن مسلمہ کے ہاں ان تمام حدود کے اوپر ایک ہی حقیقت ہے اور وہ "اللہ ربنا واحد" کی ہے۔

یہ ہے وہ اساسی فرق جس کی بنا پر کہ مسلمہ اسلام کی اساس مذہب ہے اور مذہب کا تصور انسانی وحدانیت کا دعویٰ نہیں ہے، بلکہ رنگ و نسل اور حسب نسب کے امتیازات سے انسانی برادری کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔

مضمون: شاعر مشرق اور بین الاقوامیت

ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرم

روزنامہ نوائے وقت لاہور

۹ نومبر ۱۹۶۶ء

فہرس

ناشر کے قلم سے	۱۱
دیباچہ ... ڈاکٹر وحید عشرت	۱۷
ابلاغ	۳۶
اسلام اور ثقافت	۴۷

(ابلاغ کی مکمل فہرست اندر ملاحظہ فرمائیں)

ناشر کے قلم سے

پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف کا زیرِ نظر رسالہ "البلاغ" پہلی مرتبہ ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ علی گڑھ سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اب ادارہ پاکستان شناسی کے لیے یہ بات یقیناً فخر و انبساط کی ہے کہ تقریباً ایک صدی گزر جانے[1] کے بعد مکرمی ڈاکٹر وحید عشرت زیدہ مجدہٗ (سابق ڈپٹی ڈائریکٹر، اقبال اکادمی، لاہور) کے گراں قدر دیباچے کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

قبل ازیں ادارہ، مولانا سلیمان اشرف مرحوم کی ایک اہم کتاب[2] "النور" گزشتہ سال شائع کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہے۔ "البلاغ" جس زمانہ میں لکھا گیا، یہ ایک ایسا دور تھا جہاں اسلامیانِ ہند اپنے بہت سے ملکی مسائل سے دوچار تھے وہیں ٹرکی کی خلافت عثمانیہ اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت جیسے چیلنجز نے ان کے اضطراب کو دو چند کر دیا تھا۔ عالمِ اسلام پر مصائب اور مشکلات کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی کی سامراجی حکومت نے ٹرکی کے شہر طرابلس (تریپولی) پر کسی اشتعال کے بغیر حملہ کر کے مسلمانوں میں شدید بے چینی پیدا کر دی تھی۔ (شمالی افریقہ میں طرابلس[3] الغرب کی یہی ایک ولایت باقی رہ گئی تھی جس پر خلافت کا پرچم لہرا رہا تھا

---

[1] آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ ایک الگ المیہ ہے، بدقسمتی سے ہمارے مذہبی حلقوں میں تاریخ پر کام کرنے کا رواج نہیں ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ سراج الدین احمد (ایڈیٹر چودھویں صدی، راولپنڈی) مرحوم نے ایک موازنہ میں بڑی دل لگتی بات کہی ہے کہ یورپ کی زبانوں میں ایک ایک مضمون پر ہزارہا تصانیف موجود ہیں اور وہ اسی مضمون پر آئندہ لکھنے کے واسطے کوئی وجہ ممانعت نہیں ہیں، مگر ہماری قوم کی علمی بدشوقی اور ناقدردانی، پُر جوش اور پُر ہمت ہاتھوں سے بھی قلم کو گرا دیتی ہے۔ (حیات صلاح الدین ایوبی، ص ۴)

[2] النور (۱۹۲۱ء) دو قومی نظریہ پر ایک مستند تصنیف ہے۔ ستاسی (۸۷) سال کے بعد شائع ہوئی تو قومی رسائل و جرائد اور ملک کے اہلِ الرائے نے ناشر کی اس کوشش کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا، ان تبصروں کی افادیت و اہمیت کے پیشِ نظر انہیں جلد شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ وما توفیقی الا باللہ (ظہور الدین)

[3] طرابلس الغرب اب لیبیا کے نام سے ایک آزاد اور خود مختار حکومت ہے۔

اور جس پر انگریزوں یا فرانسیسیوں نے قبضہ نہیں کیا تھا) اٹلی اور ترکی کے درمیان عداوت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ طرابلس میں اکثریت مسلمانوں کی تھی جو نسلاً عرب اور ترک تھے۔ اٹلی کے وزیر خارجہ نے دو دسمبر ۱۹۱۰ء کو اپنی پارلیمان میں اس اعلان کے باوجود کہ اٹلی طرابلس کو ترکی کا حصہ تسلیم کرتا ہے، یہ چارجانہ کارروائی کی۔ دراصل اٹلی کو یہ بات بُری طرح کھٹکتی تھی کہ فرانس، تیونس پر قابض کیوں ہے؟ جبکہ اٹلی، تیونس پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ فرانس نے اپنا امن چاہنے کے لیے اٹلی کو یہ سمجھا یا کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرلے۔ گو اس بارے میں فرانس نے کوئی باضابطہ اجازت نہ دی تھی، لیکن طرابلس پر اٹلی کے حملے کے وقت فرانس کی خاموشی اور مصری لیبر جماعت کی اطلاعات فرانس کی بدنیتی کا واضح ثبوت تھا۔ ترکوں کو مصر کے راستے طرابلس میں فوج بھیجنے سے روک دیا گیا اب کہ مصر اس وقت تک ترک خلافت کا حصہ تھا اور برطانیہ کو ایسے کسی اقدام کا حق نہیں پہنچتا تھا۔ مذکورہ کارروائیوں سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسا کہ سلطنتِ ترکوں کو چاہ کر کے شاید ہمیشہ کے لیے اس کو یورپ سے نکال دیں گی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کرلیا۔ طرابلس کے کئی حصہ پر فوجی جارحیت اور غاصبانہ قبضہ پر ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطراب ایک قدرتی امر تھا۔

ایک ہی سال بعد اکتوبر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی چار ریاستوں بلغاریہ، سربیا، مونٹی نیگرو اور یونان نے پہلے سے کیے گئے ایک خفیہ معاہدے کے تحت اس بہانے ترکی پر حملہ کردیا کہ سلطنتِ عثمانیہ میں عیسائیوں پر ظلم ڈھایا جارہا ہے۔ ترکی کے لیے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ پہلے ہی طرابلس میں اٹلی کے ساتھ برسرِ آزار تھا اور ایک وقت دو محاذوں پر لڑنا اس کے لیے دشوار تھا۔ لہٰذا ترکی نے اٹلی کے ساتھ صلح کرلی اور طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کرلیا۔ ادھر اٹلی نے لیبیا کے جزائر سے اپنی فوج ہٹانے پر رضامندی ظاہر کردی مگر بعد میں اپنے وعدے سے منحرف ہوگیا۔ ۱۹۱۳ء کو لندن میں برطانیہ کی معاملت پر مذکورہ بالا چاروں عیسائی ریاستوں کے ساتھ ترکی کا ایک معاہدہ طے پایا۔ اس طرح جنگ بند ہوئی اور بلقان پر ترکوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ؎

؎ سلطنتِ عثمانیہ کا تاریخی پس منظر، ظفر حسن ایبک، ص ۲۰۰

بلقان طرابلس (۱۲-۱۹۱۱ء) اور بلقان (۱۳-۱۹۱۲ء) میں ترک بے رحمی سے شہید کیے گئے، جو مظالم مسلمانوں پر ہوئے اس کا مختصر حال مولانا محمد علی کے اخبار "کامریڈ" مورخہ ۸ فروری ۱۹۱۳ء میں بڑی اچھی طرح ملتا ہے۔

"مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ مسلمان عورتوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا ان کے خاوندوں کو قتل کر دیا گیا۔ دو لاکھ چالیس ہزار مسلمان شہید کیے گئے۔" [1]

ترکوں پر ڈھائے جانے والے صلیبی مظالم پر ہندوستان کے مسلمانوں کا ردِ عمل اور مقاماتِ مقدسہ کے متعلق تشویش و اضطراب میں مبتلا ہونا ایک فطری امر تھا۔ نعیم احمد لکھتے ہیں:

"سلطنت عثمانیہ کے خلاف اتحادی ممالک کے جارحانہ حملے سے پورے عالم اسلام کے مسلمانوں میں بے چینی اور اضطراب پھیل گیا۔ اور دنیا بھر کے اسلامی خطوں میں تمام تر ہمدردیاں ترکوں کے لئے تھیں۔ اور وہ ان کی کامیابی کے متمنی تھے۔ ہر لحظہ مقاماتِ مقدسہ پر مین الشریفین کی طرف بھیلتی آگ کی تپش ان کے دلوں میں نفرت کا لاوا بھڑکا رہی تھی۔" [2]

چنانچہ ان ہی ایام میں ہندوستان کے مسلمانوں نے ایک طبی وفد زیرِ قیادت ڈاکٹر مختار احمد انصاری ترکی بھیجا۔ دوسرا وفد مسلمانانِ مدراس نے بھیجا۔ وفد نے ترکی جا کر زخمی ترکی سپاہیوں کی ہر ممکن مدد کی۔ اس وفد کے ذریعے سے مسلمانانِ ہند اور عالم اسلامی کے ٹوٹے ہوئے رشتے قائم ہو گئے۔ اسی دوران ہندوستانی مسلمانوں نے سلطنت عثمانیہ کی سالمیت، مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت اور بیرونِ ہند مسلمانوں کی مدد کے لیے مولانا عبدالباری فرنگی محلی (م-۱۹۲۶ء) کی سربراہی میں ۲۰ مئی ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ میں انجمن خدام کعبہ قائم کی، جس نے ملک کے گوشہ گوشہ میں،

---

[1] عبدالحامد قادری بدایونی، مولانا، خطبہ صدارت پاکستان کانفرنس مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۶۱ء بمقام بمبئی کے موقع پر خطبات صدارت (مطبوعہ مکتبہ نظامیہ بریلی، بدایوں) ص ۱۰۔ بحوالہ انتباہ ملک

[2] تجارتِ عراق عثمانی ترک اور شریف مکہ کی ذہنیت، لاہور ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۹

[3] حضرت سوہانی حیات اور کارنامے از ڈاکٹر احمد فاروقی، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۹۹

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی وغیرہ کی کوششوں سے مسلمانوں کے اندر ولولۂ عمل پیدا کیا[1]۔ نیز وہ علمائے کرام و مشائخ عظام جو اپنی خانقاہوں اور مدارس میں بیٹھ کر خدمت کر رہے تھے اور میدانِ سیاست میں نہ آتے تھے باہر نکل آئے چنانچہ مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی (۱۸۷۸ء۔۱۹۲۶ء) کے علاوہ حضرت مولانا عبدالماجد صاحب قادری بدایونی (۱۸۸۷ء۔ ۱۹۳۱ء) حضرت مولانا سید محمد فاخر الٰہ آبادی (۱۸۵۶ء۔۲۱ر جولائی ۱۹۳۰ء) سجادہ نشین دائرہ شریف، جیسے مقدس و محترم حضرات بھی نکل کھڑے ہوئے۔ انجمن خدام کعبہ کو کافی تقویت حاصل ہوگئی اور گورنمنٹ نے انجمن کی تحریک سے متاثر ہو کر اعلان کیا کہ نتیجۂ جنگ خواہ کچھ بھی ہو مقاماتِ مقدسہ محفوظ رہیں گے[2]۔ اسی زمانہ میں نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین (۱۸۴۱ء۔ ۱۹۱۷ء) نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہے کہ ان واقعات کے دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدہ میں آرہے ہیں مسلمانوں کو یہ مشورہ دینا کہ وہ گورنمنٹ پر بھروسہ کریں لاحاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ اس قسم کے اعتماد کا نہیں رہا۔" [3]

جنگِ طرابلس و بلقان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالحامد بدایونی (۱۸۹۸ء۔۱۹۷۰ء) اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اس جنگ کو تمام عیسائی دنیا نے صلیبی جنگ سے تعبیر کیا۔ مسٹر اسکوتھ وزیر خارجہ برطانیہ نے اپنی تقریر میں یہاں تک کہا۔

"ساتویں صدی سے سترھویں صدی تک مغرب کو جو صدمات اسلام نے پہنچائے

---

[1] خطبۂ صدارت پاکستان کانفرنس، منعقدہ ۳۰ر اگست ۱۹۴۱ء (رائے کوٹ ضلع لودھیانہ) از مولانا عبدالحامد بدایونی۔ طبع اوّل، نظامی پریس بدایوں، ص ۱۱

[2] "مقصدِ پاکستان" (مرتب) ظہیر الاسلام فاروقی مجلس اخوۃ اسلامیہ پاکستان، لاہور۔ بار اوّل ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۵

[3] "تحریک پاکستان میں مولانا عبدالحامد بدایونی کے کردار کی ایک جھلک"۔ ترتیب و تدوین: ظہور الدین خاں امرتسری، ادارۂ پاکستان شناسی لاہور، ۲۰۰۵ء، مشمولہ خطبۂ صدارت پاکستان کانفرنس (منعقدہ ضلع لودھیانہ) مطبوعہ بدایوں ۱۹۴۱ء، ص ۱۱

"مقصدِ پاکستان" مرتبہ ظہیر الاسلام فاروقی، ص ۱۵۹۔۱۶۰ بحوالہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ جنوری ۱۹۱۲ء

ہیں[1]۔ اب اُن سب کے بدلہ کا وقت ہے۔ اس لیے ایک طرف ترکی اور دوسری طرف پرشیا (مراد فارس / ایران) سے اسلامی طاقت کو تباہ کیا جائے گا۔" ۲

اب مذکورہ تناظر میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک عامی مسلمان بے چین نہ ہوتا اور اس کا دل خون کے آنسو نہ روتا اور مولانا سلیمان اشرف تقریراً و تحریراً اپنے جذبات کا اظہار نہ کرتے چنانچہ زیرِ نظر رسالہ میں جہاں وہ مسلمانانِ عالم پر ڈھائے جانے والے مظالم، یورپین ممالک کے جبر و استبداد اور ان کی اسلام دشمنی کا سبب بیان کرتے ہیں وہیں وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ دنیائے اسلامی کے کسی گوشے کے مسلمانوں کو تکلیف و اذیت پہنچے تو وہ تکلیف پورے عالم اسلامی کی تکلیف ہونی چاہیے، کیوں کہ اسلام نے تمام مسلمانوں کو تنِ واحد کے اعضا کی طرح مربوط قرار دیا ہے۔ ایک عضو کی تکلیف کا اثر دوسرے اعضا پر پڑتا ہے اور اعضائے رئیسہ کے صدمہ سے تمام بدن[sic] متاثر ہو جاتا ہے، اب البلاغ سے متعلقہ اقتباس ذیل میں ہدیہ ناظرین ہے:

"اس وقت تمام بلادِ اسلامیہ پر جو ستم و جفا کے بادل ٹوٹ پڑے ہیں وہ صرف اس

---

۱ "صلیبی لڑائیوں کے زمانہ کو بعض عیسائی مورخوں نے گیارہویں صدی کے اختتام سے لے کر سولھویں صدی عیسوی کے اختتام تک شمار کیا ہے۔ اور عثمانی ترکوں نے جو لڑائیاں یورپ پر حملہ کرنے میں عیسائیوں سے کی ہیں اُن کو بھی صلیبی لڑائیوں میں داخل کر لیا ہے، اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ عثمانی ترک چونکہ اُس زمانہ میں ایک فاتح اور حملہ آور، نہایت غالب قوم تھی اور ممالک یورپ کو کچھ عرصہ کے واسطے انھوں نے بے چین اور بدحواس کر دیا تھا۔ اور ترکوں کے مقابلہ کرنے کی تاب جب بعض ممالک یورپ نہیں لا سکتے تھے تو اپنے ہم قوموں سے ایک پُر جوش امداد حاصل کرنے کے واسطے صلیبی لڑائی کا نام ہی اُن کے پاس ایک چلتا ہوا اور مؤثر جادو تھا۔ اس وجہ سے ترکوں کی لڑائیوں کو بعض مورخوں نے صلیبی لڑائیاں کہہ دیا ہے ورنہ درحقیقت صلیبی لڑائیاں (کروسیڈ) صرف اُن لڑائیوں کا نام ہو سکتا ہے جو "شام میں بیت المقدس حاصل کرنے کے واسطے کی گئیں۔" اسی طرح اُن تین ہزار سات سو (۳۷۰۰) لڑائیوں کو جو ہسپانیہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان کئی صدیوں تک ہوا کیں۔ اور آخر کار مسلمانوں کے اُس ملک سے قطعی اخراج پر ختم ہو گئیں، صلیبی لڑائیاں کہنا روا نہیں ہے۔" (سراج دین احمد۔ "حیاتِ صلاح الدین ایوبی" مطبوعہ الفیصل لاہور ۱۹۹۳ء۔ دیباچہ صفحہ اوّل)

۲ دیکھیے۔ عبدالحامد بدایونی، مولانا۔ خطبۂ صدارت پاکستان کانفرنس ۳۰ / اگست ۱۹۴۱ء (ضلع لودھیانہ) ص ۱۰، مشمولہ "انتخابات کے ضروری پہلو" شائع کردہ روہیل کھنڈ لیگ پارلیمنٹری بورڈ، مطبوعہ عثمانی پریس بدایوں، یو۔ پی ۱۹۳۶ء

۳ چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

علت میں کہ مسلمان لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کیوں کہتے ہیں" [1]

"ایران و ترکی پر جو موت کہ لائی جارہی ہے اس سے اگر مسلمانوں میں بے قراری و اضطرار پیدا ہو تو یہ موجب تعجب نہیں۔ اس لیے کہ اسلام نے جس ہمدردی و رافت و رحمت کا سبق مسلمانوں کو پڑھایا ہے وہ اُن کے قلوب سے محو ہو نہیں سکتا۔ گئے اور بلّی کی تکلیف سے بھی اُن کا دل بلبلا اُٹھتا ہے۔ چہ جائیکہ انسان اور پھر انسانوں میں اُن کے دینی بھائی، جن کے باب میں حدیث یوں ارشاد فرمائے۔ مثل المؤمنین کرجل واحد اذا اشتکیٰ عینہ اشتکیٰ کلّہ و اذا اشتکیٰ راسہ اشتکیٰ کلّہ۔ تمام مؤمنین کی مثال ایک شخص واحد جیسی ہے، جب کہ اُس کی آنکھ دکھتی ہے تو تمام جسم دردمند ہو جاتا ہے اور جب سر میں درد اُٹھتا ہے تو سارا بدن آزار مند ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں کے کانوں میں یہ صدا پہنچتی ہے کہ ایران میں اُن کے بھائی روسیوں کے بے رحم خنجروں سے شہید ہوئے تو وہ اپنے بستروں پر تڑپ جاتے ہیں، جب یہ خبر ملتی ہے کہ عربوں کے خون سے طرابلس کی زمین لالہ زار بن گئی تو اُن کے قلوب سینے میں خون ہو کر بہنے لگتے ہیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے افراد کا مجموعہ بہ منزلہ شخصِ واحد کے ہے گو اجسام متعدد ہیں مگر رُوح سب میں ایک ہی ہے اور یہ وہی روح ہے جسے آج سے تیرہ سو (۱۳۰۰) برس پیشتر نبی اُمّی رُوحی فداہ نے مکّے کے ریگستانوں اور طیبہ کی وادیوں میں بیٹھ کر قُولُوا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ کر پھونکی تھی۔" [2]

بلاریب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی صدا اُن تمام معاشروں کے لیے دعوت مبارزت تھی اور ہے جو خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دین سے کدّ رکھتے ہیں اور یہ

---

[1] اہل اسلام اور خلافت، ص ۲۴۔۲۶، مشمولہ البلاغ از سید سلیمان اشرف، طبع مطبع احمدی علی گڈھ۔ اشاعت اوّل سنہ ندارد

بانگِ اسلام، دشمنانِ دین اور مخالفین اسلام کو نہ اُس وقت گوارا ہوئی نہ اب تک ہو سکی، کیوں کہ کفر کے کسی شعبے میں اسلام سے متعلق نظریاتی نرمی کبھی رونما ہوئی نہ ہوگی۔ چنانچہ عالم اسلام میں کفر و اسلام کے مابین یہ جنگ بمصداق ع رہی ہے معرکہ آرا ازل سے تا ایں دم، آج بھی جاری ہے، جس کی زندہ مثال، جدید مغربی تہذیب کے علم برداروں کا نو گیارہ ۹/۱۱ (۲۰۰۵ء) کے بعد افغانستان میں اور عراق کی مقدس سرزمین پر اپنی بربریت کا عملی مظاہرہ کیا جانا ہے جس میں لاکھوں مسلمانوں کا اب تک خون بہایا جا چکا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالشکور ساجد..... مغربی ممالک بظاہر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے فلسفہ عدم تشدد کے پرچارک ہیں لیکن بہ باطن انہوں نے ظلم و تشدد کی ایسی کوئی صورت اور طریقہ نہیں چھوڑا جو اپنے طور پر مسلمانوں پر آزمانہ لیا ہو۔[1]

.....

مولانا سلیمان اشرف نے البلاغ میں خلافت عثمانیہ کے چیدہ چیدہ واقعات پر سرسری روشنی ڈالی ہے اور سلطنت ترکی کے زوال کے اسباب پر گفتگو کی ہے۔ آل عثمان کی حکومت (۷۰۰ ہجری تا ۱۳۴۲ ہجری/۱۳۰۰ء تا اکتوبر ۱۹۲۳ء) چھ سو تیئیس (۶۲۳) سال رہی۔ ایسی طویل مدت کسی اسلامی حکمران خاندان کو نصیب نہیں ہوئی۔ سترھویں صدی میں اس سلطنت کا زوال شروع ہوا جس کی طاقت سے مغربی حکومتیں کانپ جاتی تھیں۔ سلیم اوّل کے بیٹے سلیمان اوّل (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) کا دورِ حکومت ہر اعتبار سے ترک حکومت کی عظمت اور عروج کا دور تھا۔ سلیمان اوّل کی وفات کے بعد سلطنتِ عثمانیہ میں زوال کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ وجہ اندرونی خلفشار تھا۔ سلیمان کی وفات کے بعد بہت سے سلطان ایسے آئے جو حکومت کے اہل نہ تھے۔ نیز وقت کی ضروریات اور تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ امام خمینی اپنی مشہور عربی کتاب ''الحکومت الاسلامیہ'' میں اتحاد اسلامی کی ضرورت کے زیرعنوان لکھتے ہیں۔ 'ہمیں اس حقیقت سے مجال انکار

.....

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ عبدالشکور ساجد انصاری، ڈاکٹر۔ مضمون ''اسلام دشمنی کی تاریخ۔ اسباب، محرکات اور حل'' (مجلہ جمال کرم، لاہور۔ رمضان ۱۴۲۹ ہجری، ج ۵ ش ۳) ص ۴۷

[2] علامہ محمد اسلم جیراجپوری۔ تاریخ الامت، (جلد ہفتم، تاریخ آل عثمان) مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۵ء

نہیں ہے کہ عثمانی حکومت کے اکثر حکام ملکی مفاد اور نظمِ مملکت سے بالکل کورے اور نا اہل تھے۔ ان میں سے بعض خود ملک میں بگاڑ کے خواہاں تھے اور ان کی اکثریت عوام کی گردنوں پر مطلق العنان بادشاہوں کی طرح مسلط تھی۔ علاوہ ازیں فوجی تنظیم میں فقدان اس زوال کی ایک اہم وجہ تھی۔ زوال میں اُن نوجوان عیسائی فوجیوں نے بھی اہم کردار ادا کیا، جو دراصل ترکوں کے مقبوضہ علاقوں کے صاحبِ اثر عیسائیوں کی اولاد تھے اور انہیں سلطان کے فوجی دستوں میں شامل کرنے کے بعد زبردست فوجی تربیت دی گئی تھی۔ اُن میں اکثر نے دکھاوے کے لیے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان لوگوں کو کسی سے ملنے جلنے اور شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ۱۵۶۶ء میں جب انہیں شادی کرنے کی اجازت دے دی گئی تو فوری طور پر دو نتائج برآمد ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اُن میں اپنے موروثی مذہب اور نسل کا خیال پیدا ہوا اور دوسرے یہ کہ اُن کی فوجی تنظیم میں پہلے جیسی بات نہ رہی۔[1] سلطنت عثمانیہ کی تنزلی کے درج ذیل وجوہ کو دیگر وقائع نگاروں نے بھی قلم بند کیا ہے۔

۱۔ ترکی میں مسلمانوں کی خانہ جنگیاں انہیں کمزور کرتی چلی گئیں، اگر طاقت کافی ہوتی تو دشمن انہیں کیا مغلوب کر سکتے۔

۲۔ ترکوں کے بدخواہ ان کے اپنے حلقوں میں پیدا ہو گئے، جنہوں نے دشمنوں سے موافقت کی اور ترکوں نے ان پر اعتبار کیا۔

۳۔ طوائف الملوکی اور ہر شخص کا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی سلطنت علاحدہ قائم کرنے کی طمع رکھنا۔[2]

۴۔ بلقانی ریاستوں کو ترکی حکومت کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا کر دول مغرب نے انہیں میدانِ جنگ میں اتارا، ان کا ساتھ دینے، انہیں مالی اور مادی مدد دینے کے لیے، یورپین حکومتوں کے خزانے کھل گئے۔

۵۔ ترکی کو ناچار کر دیا گیا کہ وہ طرابلس سے نکل جائے، جبکہ الجزائر، تیونس اور مراکش پر فرانس

---

[1] جدید عالم اسلام از صلاح الدین ناسک۔ عزیز بک ڈپو لاہور، اشاعت سوم ۱۹۸۰ء، ص ۳۹۔۴۰

[2] حیات صدر الافاضل۔ از مفتی حکیم سید غلام معین الدین نعیمی، طبع فرید بک سٹال لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۴ بعنوان: ترکوں کی اعانت کا طریقہ

پہلے ہی قابض ہو چکا تھا۔

۶۔ عراق، شام، لبنان اور حجاز وغیرہ میں برطانیہ نے اپنے گماشتوں کے ذریعے، ترکوں کے خلاف سازشوں کے جال بچھائے، اور ان علاقوں کو ترکی سلطنت سے بغاوت کرنے اور 'گریٹ عرب ایمپائر' کا خواب شیریں دکھایا گیا۔ [1]

۷۔ انیسویں صدی کے اواخر میں عربوں میں قومیت کا شدید جذبہ لہریں مارنے لگا اور وہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) کا خاطر خواہ فائدہ اُٹھا کر عثمانی اقتدار اعلیٰ سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو گئے۔ [2]

۸۔ مذکورہ عالمی جنگ ختم ہوتے ہی استعمار نے دولت عثمانیہ کو بہت سی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ اور ہر ریاست پر اپنے ایک آلۂ کار کو سربراہ کی حیثیت سے مسلط کر دیا۔

۹۔ آلِ عثمان کی خلافت کو تباہ کرنے کے لیے ملّت سسٹم' (اقلیتوں کے حقوق) کے ذریعے حاصل کردہ سہولتوں اور ارمنی بیگمات کے ذریعے 'باب عالی' (مرکز آلِ عثمان) میں تخریبی سازشوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلایا گیا اور جاسوسی نظام کی مدد سے سلطنت کو تباہ کیا گیا۔

۱۰۔ آلِ عثمان کے آخری دور میں ترکوں اور عربوں کے درمیان بغض و عناد پھیلایا گیا اور بالآخر کرنل لارنس (۱۸۸۸ء۔۱۹۳۵ء) نے ترکوں کے خلاف عربوں کو بغاوت پر ابھارا اور سلطنتِ عثمانیہ کو عرب علاقوں سے ختم کر کے آخر کار کرنل لارنس کی سازش کے نتیجے میں اقوام مغرب کا غلام بنا دیا۔ اسی سازش کی بابت علامہ اقبال کو کہنا پڑا۔

ترکانِ 'جفا پیشہ' کے پنجے سے نکل کر بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار ا [3]

---

[1] کاروانِ گم گشتہ۔ سید رئیس احمد جعفری ندوی، مطبوعہ انجمن پریس کراچی۔ بار اوّل ۱۹۷۱ء، ص ۲۶۸ زیر عنوان: 'بلقان کے خلاف مغرب کی سازش'

[2] ہندوستان، اسلام اور مغربی ایشیا از پروفیسر محمد شفیع گوانی۔ مکتبہ جدید، نئی دہلی ۱۹۹۹ء، ص ۶۷

[3] اتحاد بین المسلمین۔ وقت کی اہم ضرورت (حصہ دوم) از مولانا محمد عبدالستار خان نیازی۔ مکتبہ رضویہ، لاہور۔ طبع ۱۹۸۸ء، ص ۲۶ اور ۲۷

اسلامی سیاسی نظریے کے بہ موجب اسلامی ریاست تین ستونوں پر قائم تھی: اُمّہ، خلافت اور شریعت۔ لیکن پہلی عالمی جنگ کے بعد عثمانی سلطنت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی، تو نئے ترکی حاکموں نے جو ایک جدید جمہوریہ قائم کرنا چاہتے تھے، ماضی سے بالکل قطع تعلق کرتے ہوئے خلافت کا عہدہ اور ادارہ ہی ختم کر دیا۔[1] گو کہ ترکی کے باہر خلافت کے احیا کی چند ناکام کوششیں ہوئیں، لیکن بالآخر یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ اور کمال اتاترک (۱۸۸۱ء-۱۰ر نومبر ۱۹۳۸ء) کی سربراہی میں ایک سیکولر آئین اختیار کیا جس کے رُو سے انہوں نے جبراً، طوعاً اور کرہاً ترکی کو سیکولر بنانے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایک مغربی تہذیب سے مرعوب شخص کر سکتا تھا۔ مذہب اور ریاست کو الگ الگ کر دیا۔ تعدد ازدواج پر پابندیاں عائد کیں، لاطینی رسم الخط رائج کر کے عربی کو متروک قرار دیا، پردہ اور ترکی ٹوپی (فیز) ممنوع قرار دے دیے۔[2] پرانے استعمال شدہ یورپی کپڑے منگا کر لوگوں کو پہنانے پر مجبور کیا تاکہ ترکی کا قدیم مسلم شناخت کا لباس ترک کر دیا جائے، اذان تک ترکی زبان میں دینے پر مجبور کیا گیا۔ ایک ایسی فوج منظم کی جس کا کام ترکی نظریاتی یعنی سیکولر سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔[3]

بیسویں صدی کے دوران ترکی اور ایران آزاد ریاستوں کے طور پر ابھرے، لیکن منتشر عالم عرب میں رونما ہونے والی متعدد قومی ریاستوں کے وجود سے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں اُمّہ کا تصور ماند پڑ گیا اور اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور ملّتِ اسلامیہ آج تک ان صدمات سے نجات حاصل نہ کر سکی۔ چنانچہ عالمِ اسلام کی ٹکڑیوں میں تقسیم اور ماضی قریب میں عراق ایران کے بیچ لڑی جانے والی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے ایک بھارتی قلم کار جناب پروفیسر محمد شفیع اگوانی[4]

---

[1] ہندوستان، اسلام اور مغربی ایشیا، ص ۶۸

[2] جدید عالمِ اسلام (از) صلاح الدین نائک، ص ۳۶

[3] روزنامہ ایکسپریس کراچی، ۲۰ر نومبر ۲۰۰۸ء۔ اور یا مقبول جان، کالم زیرِ عنوان: حرف راز

[4] پروفیسر محمد شفیع اگوانی (پ ۱۹۲۸ء، بمقام اودے پور) تعلیم راجستھان اور بالینڈ میں حاصل کی اور اپنے کیریر کا آغاز علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ ۱۹۵۷ء میں دہلی کے انڈین اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز میں مغربی ایشیا کے

(باقی بر صفحہ آیندہ)

وابستہ رکھے ہیں۔ اس کی مثال ایران، عراق، سعودی عرب، ترکی اور مصر وغیرہ کے امریکہ اور سابق سوویت روس سے خفیہ اور اعلانیہ اتحادوں سے دی جا سکتی ہے۔

اس پس منظر میں "عالم اسلامی" کی اصطلاح میں اطلاعات کا عنصر بہت زیادہ ہے اور حقیقت کا بہت کم۔ اسلامی تنظیم کانفرنس کی بے بسی اس سے ظاہر ہے کہ اس نے عالم اسلامی کے حال کے علاقائی، نسلی اور سیاسی جھگڑوں کو نپٹانے کی کوئی سنجیدہ کوشش تک نہیں کی۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تنظیم کے کسی بھی سربراہ نے (بانی دعوؤں کے علاوہ) مسجد اقصیٰ کو اسرائیل کے قبضے سے چھڑانے کے لیے کبھی [illegible] حالانکہ اسی مسئلہ کو لے کر اسلامی تنظیم کانفرنس وجود میں آئی تھی۔"[1]

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پروفیسر اگوانی رقمطراز ہیں:

"یہی بات تو یہ ہے کہ مغربی ایشیا کی ہر ریاست، دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح اپنی پالیسی مذہبی ہم آہنگی کی بنا پر نہیں، بلکہ ان مفادات کی بنا پر متعین کرتی ہے، جنہیں وہ اپنے حق میں تصور کرتی ہے۔ چنانچہ حال میں یہ کہنا سولہ آنے صحیح نہیں ہے کہ ایران نے ہی تسلیم کیا، جو پاکستان کی امور خارجہ سے متعلق پارلیمانی کمیٹی کے سربراہ ہیں۔ آپ نے اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر پر مسلم ممالک کے لیڈروں کی حمایت حاصل کرنے میں پاکستان کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جب مسلم ممالک کے لیڈر پاکستان تشریف لاتے ہیں تو وہ مسئلہ کشمیر پر اپنے میزبان ملک کی حمایت کرتے ہیں لیکن جب اقوام متحدہ میں ووٹ دینے کا وقت آتا ہے تو وہاں تو مفادات فیصلہ کن

---

[1] "مسلمانوں کی عالمی تنظیم (او۔ آئی۔ سی) ان کی اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ غیر مؤثر ہوتی جا رہی ہے۔ اسلامی اتحاد کسی مسلم ملک کے اپنے اندر بسنے والے اسلامی ملکوں کے رابطے ہے۔ اگر یہ بھی جاتا تو اسلامی دنیا کو متحد کرنے کی سکت نہیں رکھتی اور تو اور، عرب اور جب مل کر بھی، ایک امریکہ کے مقابلے میں آ جانے کی سکت نہیں رکھتے۔" (اسلام، مسلمان اور مغربی دنیا، پروفیسر خورشید احمد، ص ۱۳۳)

[2] ہندوستان، اسلام اور مغربی دنیا، پروفیسر محمد ضیاء اگوانی، مطبوعہ مکتبہ جامعہ طبع اول ۱۹۹۹ء، ص ۹۰، ۹۱

رول ادا کرتے ہیں، جیسا کہ اقوام متحدہ کے حالیہ اجلاس میں ہوا، جب کہ پاکستان تیسری بار مسئلہ کشمیر پر ریزولیوشن پیش کرنے میں ناکام رہا۔"[1]

عالم اسلام آج جس انتشار اور خلفشار کا شکار ہے اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں تو بات ہو رہی تھی ترکوں کی ہزار سے کے حوالے سے۔ ترکوں کی جو سب میں فتوحات اور ترقی کا راز یہ تھا کہ ایک طرف ترک عرب اور دوسری مسلمان قومیں متحد تھیں اور دوسری طرف عیسائی یکطرفہ اور آپس کی فرقہ بندیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ عیسائی فرقہ دوسرے عیسائی فرقہ کی تباہی سے خوش ہو رہا تھا۔ زمانے نے بتا دیا کہ بالآخر یہ حالت بدل گئی، مسلمان ترک و عرب کی قومیتوں میں بٹ گئے اور ادھر تمام عیسائی قومیں متحد ہو گئیں، نتیجہ زوال تھا۔

اس سے زیادہ افسوس یہ کہ ایک ملک اور ایک قوم کے بھی تمام مسلمان باہم متحد نہیں۔ عرب کی ایک قوم آج بیسیوں اقوام میں بٹ چکی ہے۔ عرب کا ایک ملک بیسیوں ٹکڑوں میں تقسیم ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ مسلمانان عالم کی تفریق اور انتشار کی مصیبت کو جس نے سب سے زیادہ ابھارا وہ قومیت پرستی کا وہ جذبہ ہے، جو یورپ کی بیشتر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کر کے ہم نے حاصل کیا، یہی وہ جذبہ ہے جس کے مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا، اور جس جذبہ کو اس نے جاہلیت کی مصیبت "کہہ کر پکارا۔

ہم میں ترک، عرب، مصر، عرب، ہندو، چین، کے جھگڑے پیدا ہو گئے باوجودیکہ مسلمانوں میں اصلاً صرف ایک قومیت تھی، اور وہ صرف اسلام کی، مسلمان کسی ملک سے کسی بھی ملک کو نکل جاتا، وہ خود کو تمام حقوق کے لحاظ سے اپنے ہی ملک میں سمجھتا تھا، مگر جب ترک اپنی قومیت، ایران اپنی پارسیت، مصر اپنی مصریت، عرب اپنی عربیت پر نازاں ہونے لگا، اور اسی جذبہ کی ترقی کو اپنی آئندہ کی کامیابی کی بنیاد قرار دینے لگا۔ اب مصر و ایران اور ترک و عرب ممالک میں نہایت سرعت اور تیزی کے ساتھ یہ قومی جذبات (بیشتر اسلام کے) جس قدر ترقی پاتے گئے تو دنیا نے دیکھا کہ اسی قدر عالم گیر

---

[1] محمد علی آکولی بی۔ اے، ہندوستان، اسلام اور مغربی تہذیب، ص ۱۰۔ الناظر پریس، دہلی ۱۹۳۹ء، ص ۹

اسلامی نظام کے دانے بکھر گئے۔ اور اب عالم یہ ہے کہ ستاون (۵۷) اسلامی ممالک ہیں، مگر اتنی بڑی تعداد اور ہر قسم کے وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود نہ صرف عالمی قوت کی حیثیت اختیار نہیں کر سکے بلکہ پس ماندہ اور غیر منظم ہونے کے باعث اسلام دشمن قوتوں سے مار کھا رہے ہیں[1]۔

مولانا عبدالحامد بدایونی، عالم اسلامی کا انتشار کے زیر عنوان لکھتے ہیں۔ 'افسوس جس ملت نے دنیا کی قیادت کی وہ آج اپنے انشقاق و افتراق کی بدولت غیروں کے دامن میں پناہ لے کر اپنا مستقبل تاریک کر رہی، مغربی لعنتیں اختیار کر رہی ہے۔ وطنیت کی بلائے عظیم ہر طرف عام ہے جسے دیکھو وہ وطنیت کے جذبہ سے سرشار ہے، یا عصبیت باہمی رقابت ترقی کر رہی ہے۔ ان تمام تحریکات میں کفر اپنا کام کر رہا ہے۔'[2]

یورپ نے خود کو امان دینے کے لیے اور اپنی بے چینیوں کے علاج کے لیے ''جمعیۃ الاقوام'' کا نسخہ تجویز کیا، لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اسلام نے 'امامت کبریٰ' یعنی تمام دنیا کے مسلمانوں کی ایک سرداری، کا نسخہ جو جمعیۃ اقوام اسلامیہ کے ہم معنی ہے، پہلے سے ایجاد کر دیا ہے، لیکن ہماری مسلمان اقوام اس نسخہ سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتی، اور دوڑ دوڑ کر شتابانہ ''ہیگ''

---

[1] عبدالسلیم چودھری، بیرسٹر۔ کالم فکر امروز (روزنامہ ''خبریں'' ملتان، یکم دسمبر ۲۰۰۸ء) بعنوان: 'اُمت واحدۃ'

[2] فلسفہ عبادات اسلامی از مولانا محمد عبدالحامد بدایونی۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۶۳

[3] ''بے شک مسلمان ممالک کی وسعت ایک دائرہ کے اندر سما سکتی تو یہ واحد منظم جماعت کی سردار تھی، چنانچہ خلافت راشدہ (۱۱ھ۔۴۰ھ/۶۳۲ء۔۶۶۱ء) اور خلافت بنی امیہ (۴۰ھ۔۱۳۲ھ/۶۶۱ء۔۷۵۱ء) میں اسپین سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک تمام مسلمان صرف ایک سردار (امیر) کے زیر علم تھے، بنو عباس (۱۳۲ھ۔ ۶۵۶ھ/۷۵۰ء۔۱۲۵۸ء) جب تخت نشین ہوئے تو اسپین الگ ہو گیا (۱۴۹۲ء) اور بقیہ ممالک ایک ساتھ رہے، اس کے بعد خلافت عباسیہ کے ضعف اور ترکوں، تاتاریوں اور دوسری قوموں اور ملکوں میں اسلام کی اشاعت کے بعد جب جمعیتوں اسلامی حکومتیں قائم ہو گئیں تو حقیقت میں خلافت، یا امامت کی حیثیت آجکل اصطلاح میں مسلمان اقوام کی جمعیت کی سرداری کی ہو گی۔۔۔۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام نے امامت یعنی مسلمان جماعتوں کی تنظیم اور سردار نظام یعنی امام و امیر کی صحیح اطاعت۔۔۔ فرض قرار دی ہے''۔ (معارف اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۲۵ء۔ شذرات۔ ص ۲۷۲ زیر عنوان 'خلافت یا امامت کیا چیز ہے؟ مسلمانوں کی منظم جماعت کی سرداری' از سید سلیمان ندوی)

کی عدالت عامہ کی جمعیۃ الاقوام کی طرف جاتی ہیں، اور اُس کی رکنیت کو اپنی آزادی اور خود مختاری کا ضامن جانتی ہیں۔ حال آں کہ اُن کی آزادی اور خود مختاری کی حقیقی ضمانت اگر ہو سکتی ہے تو امامت کبریٰ[2] کی تنظیم ہے، جس کو ہم مسلمان اقوام کی جمعیت کا لقب دے لیں۔

ڈاکٹر وحید عشرت صاحب نے البلاغ کی اشاعتِ نو پر اپنے بے لاگ دیباچے میں مولانا سلیمان اشرف کے طرزِ تحریر کو دردمندانہ جذبوں سے مرصع قرار دیا ہے، کیوں کہ مولانا نے زیرِ نظر رسالہ میں امت مسلمہ میں در آنے والی بعض خرابیوں کی نشان دہی کی ہے۔ یہاں پر یہ عرض کرتا چلوں کہ غلام آباد ہندوستان میں، مسلمان اغیار کی محکومیت اختیار کر کے وہ بے شمار معاشی، سیاسی، تمدنی، ثقافتی، مذہبی اور اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اور بقول پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں بہت سی خرابیاں تھیں۔ زوال پزیر تمدن میں بہت سے ناسور پیدا ہو چکے تھے اور اگر ان کی بروقت اصلاح نہ کی جاتی تو مزید کیڑے پڑنے کا اندیشہ تھا۔[3] چنانچہ مولانا سلیمان اشرف ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ

> ''احکام شرعیہ سے جو حضرات کہ ناواقف ہیں، اور اُنہیں توفیق اس سے آگاہی کی بھی نہیں ہوتی، وہ بربنائے جہل مرکب یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام صرف تزکیۂ نفس

---

۱ ''بدقسمتی سے ممالک اسلامیہ کا اپنا کوئی مشترکہ نظریۂ حیات نہیں اسی لیے وہ مغرب کا شکار ہیں۔ باہمی تناقض و تنافر کی وجہ سے شیرازہ منتشر ہے۔ اغیار فائدہ اُٹھا کر ایک کو دوسرے کے خلاف لڑانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ عالم اسلامی اپنے سرمایۂ حیات کو مغرب کی نذر کر رہا ہے جسے دیکھو وہ مجلس اقوام کی قیادت قبول کر رہا ہے۔'' (عبدالحامد بدایونی، مولانا محمد۔ ''قلمرو عبادات اسلامی'' ص ۶۳)

۲ خلافت بمعنی نیابت نبی، جس کا دوسرا نام امامت کبریٰ ہے، اس مسئلہ پر مولانا سلیمان اشرف نے النور میں مسئلہ خلافت کے تحت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ (ظہور الدین)

۳ غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر ڈاکٹر۔ مولانا ظفر علی خاں، حیات و خدمات و آثار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اوّل ۱۹۹۳ء، ص ۲۰

سکھلاتا ہے باقی اُسے دُنیاوی (دُنیوی) اُمور میں کوئی دخل نہیں[1]۔ اس تیرہ صدی میں جبکہ الحاد و جہل کی گھٹا مسلمانوں پر اُن کی بدنصیبی کی طرح چھائی ہوئی ہو اس طرح کی آوازیں اور بھی اسلام سے بے پروا کرنے والی ہیں۔" (البلاغ، ص ۹)

مندرجہ بالا سطور میں مولانا سلیمان اشرف نے جس اہم مسئلہ کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے، اس سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا، لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عوام میں کثرت ایسے لوگوں کی ہے، جو اسلام کو محض چند مذہبی رسوم کا مجموعہ تصور کیے ہوئے ہیں، یہ اندازِ فکر بالکل غلط اور خلافِ سُنّت ہے، جب کہ امر واقعی یہ ہے کہ اسلام ہی ہے جس نے تمدن و سیاست و حرب تمام دنیا کو سکھلایا، دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے دین و دنیا کا ہر پہلو انسانی حیات اور ضروریات کے لیے ایک مکمل ضابطہ پیش کیا، کوئی ایک بھی گوشۂ حیات نہیں جسے اسلام واضح سے واضح شکل میں پیش نہ کرتا ہو، جہاں وہ روحانی اخلاقی تعلیم دیتا ہے وہیں تمدنی، معاشرتی، تعلیمی، صنعتی، اقتصادی، تجارتی، سیاسی مسائل پر مکمل اصول پیش کرتا ہے، دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلتا ہے وہ دوسرے مذاہب کی طرح رہبانیت نہیں سکھاتا بلکہ وہ ہدایت کرتا ہے کہ جو مسلمانوں کا امام و خطیب ہو وہی اُس کا سیاسی قائد بھی ہو جب خطابت کا وقت آئے تو اُس سے بڑھ کر کوئی خطیب نہ ہو، میدانِ کارزار میں جوہرِ شجاعت دکھانے کا موقع آئے تو وہ مجاہد اعظم ہو فوجوں کی قیادت کی ضرورت ہو تو وہ امیر لشکر ہو[2]۔

آج جب کہ بقول ڈاکٹر محمد باقر مرحوم، پاکستان کے عوام کو علم سے بے بہرہ رکھا جا رہا

---

[1] "میں نہیں کہہ سکتا کہ سب سے پہلے وہ کون سا شخص تھا جس نے یہ زہریلا تخم بویا، لیکن جو بھی رہا ہو اس میں شک نہیں کہ وہ اسلام کا شدید ترین دشمن تھا اور آج بھی جو اس ..... پر قائم ہیں وہ اسلام و مسلمان دونوں کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔" (نیاز احمد نیاز فتحپوری۔ ملاحظات، بعنوان: 'مسلمان کیا کریں؟' اداریہ ماہنامہ نگار دہلی، ج ۳۵، ش ۳ بابت مارچ ۱۹۳۹ء، ص ۴)۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد ارشد (جامعہ پنجاب لاہور) نے اپنے مقالے 'اسلامی ریاست کی تشکیل جدید' میں مذکورہ بالا روش کو بے بصیرتی، کوتاہ اندیشی اور خود غرضی سے تعبیر کیا ہے۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ فلسفۂ عبادت اسلامی مولفہ مولانا عبدالحامد قادری بدایونی، طبع کراچی، اشاعت اول ۱۹۶۳ء، ص ۲۸، ۲۹

ہے، اسلام کو ایک جامد چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ جامد ظاہری و معنوی دونوں حیثیت سے ..... یعنی اسلام نام ہے ایک مخصوص قسم کی زندگی کا، ایک خاص وضع و ہیئت کا اور اس اعتقاد کا کہ علما کا کام صرف نماز، نکاح، جنازہ اور ختم درود ہی ہے۔ نیز بمصداق: مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے، اُمّتِ مُسلمہ کے سیدھے سادے افراد کو اوراد و وظائف، تسبیح و چاپ میں جوت دیا گیا ہے، یوں ایک انبوہ عمل سے کنارہ کشی اختیار کر کے خلا میں رہ رہا ہے۔ اور یہ وجہ ہے کہ ان کے ہاں اب جماعت (حبل اللہ) کا قرآنی تصور ہی مفقود ہو کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا شاہ محمد عبدالحامد صاحب قادری بدایونی، سابق صدر مرکزی جمعیۃ علمائے پاکستان نے اس کا ذمہ دار دنیا پرست علما، ایسے سجادگان اور خانقاہوں میں بیٹھنے والوں کو قرار دیا ہے "جنہوں نے وعظ و نصیحت، رشد و ہدایت، پیری و مریدی کو صرف جلب منفعت کا ذریعہ بنا لیا ہے اور جب کبھی حق و باطل کا مقابلہ ہوتا ہے[1]، تو دنیا کمانے والے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں[2]۔ حالانکہ خدا کی طرف سے انسانوں کے معلّم و ہادی اور نگران

---

1. تو یہ طبقہ اپنے کو غیر سیاسی کہہ کر راہ فرار اختیار کر لیتا ہے، لیکن اپنے ذاتی مفادات کے لیے ہر حکومتِ وقت کو آب و دانہ مہیا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ تخت حکومت پر فرعون و قارون براجمان ہوں یا نجاج و یزید، حکمران مغربی اقدار کے چوکیدار اور مبلغ ہوں یا کھلے عام اسلامی شعائر اور اقدار کو مسترد کرنے والے۔ سید فاروق القادری نے اپنی تصنیف اصل مسئلہ معاشی ہے، میں ع بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں، کے تحت اس کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔

2. چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ملک میں بیداری کے لیے جب کوئی تحریک اٹھتی ہے تو مذہبی اور تبلیغی جماعتیں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتی ہیں، آزاد عدلیہ کے حق میں شروع ہونے والی حالیہ تحریک کو ہی لیجیے، جناب طارق علی اپنی انگریزی کتاب 'The Duel Pakistan on the Flightpath of America Power' جس کا اردو ترجمہ 'زے ہوئے پیاں کتے'؟ پاک امریکہ تعلقات کی کہانی' (طبع گڈ بکس لاہور ۲۰۰۸ء) کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، میں حقیقت حال بیان کرتے ہوئے فاضل مصنف صفحہ ۱۸ پر رقمطراز ہیں۔ "یہ مذہبی گروہ نہیں ہیں جنہوں نے مشرف حکومت کو للکارا ہے۔ یہ وکیل برادری تھی جس نے مشرف آمریت کو بے بس کر کے رکھ دیا۔" نیز 'وکلا تحریک اور مذہبی جماعتیں' کے تحت ابُو عمار زاہد الراشدی اپنی تصنیف 'جنرل پرویز مشرف کا دور اقتدار' (الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ طبع ۲۰۰۸ء) میں لکھتے ہیں۔ "وکلا کی اس تحریک میں جو اپنے موقف کے حوالے سے بالکل درست اور قومی امنگوں کی ترجمان ہے کا، علمائے کرام کی دور دور تک نمایندگی موجود نہیں ہے۔ دینی حلقوں کی معروف قیادتیں اس کی صف اول میں کہیں نظر نہیں آ رہیں، حالانکہ اپنے موقف اور کاز کے حوالے سے دستور کی بالادستی اور عدلیہ کی خود مختاری کے لیے سب سے زیادہ انہیں متحرک ہونا چاہیے تھا۔"

وہ ہیں جب قوم کے امیر و غریب، حاکم و بادشاہ ٹھوکر کھائیں تو ان کا فریضہ ہے کہ اپنی تمام اخلاقی قوتوں کے ساتھ بھٹکنے والوں کو راہ راست پر لائیں اور اپنا فریضۂ حیات پورا کریں"۔ [1]

بہر کیف البلاغ کے مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ دین و سیاست کی بنیاد (اسلامی سیاست کی بنیاد زہد و اتقا عدل و انصاف پر ہے) ایک ہی ہے وہ اکٹھے چل سکتے ہیں۔ اگر سیاست سے دین کو جدا کر دیا جائے تو پھر ایک ایسا مادر پدر آزاد نظام بروئے کار آتا ہے جو بہر صورت استحصال پر مبنی ہوتا ہے۔ بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے، تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

اسلام اگر واقعی ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اور یقیناً ایسا ہی ہے تو خالق کے عطا کردہ اس کامل نظام کو من چاہے خانوں میں بانٹ کر ہم بلاشبہ بے راہ روی بلکہ بغاوت کے مرتکب ٹھہرتے ہیں۔

.....

ہمارے ہاں بعض تبلیغی اور اسلامی تنظیمیں جو احیائے سنت کی علم بردار ہیں ان کی دعوت و تبلیغ میں اسلام کے قانون، اس کے اجتماعی عدل، معاشی مساوات اور معاشرتی نظام کی بات نہیں کی جاتی، انہوں نے اپنے اجتماعات اور پروگراموں کو محض چند مذہبی مسائل اور وعظ و نصیحت تک محدود کیا ہوا ہے، اسلام کے معاشی اور سیاسی نظام کی بات تو درکنار وہ حقوق العباد جیسے اہم مسئلہ سے بھی لوگوں کو آگاہ نہیں کرتے۔ دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ حاجت مندوں اور غریبوں کے حقوق کی ادائیگی جیسے موضوعات (جنہیں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض قرار دیا ہے) ان کے خطابات میں ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ دلیل یہ ہے کہ یہ کام ان کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ غریبوں کے حقوق کی ادائیگی اور انصاف تو سیاسی مسئلہ ہے اور سیاست سے علما کو کیا کام؟..... اللہ اللہ خیر سلا!.....

[1] فلسفۂ عبادات اسلامی۔ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۷۵

اس طرح کم فہمی اور لاعلمی کی بنا پر وہ دین کی شان اور اہل دین کی شہرت کو گہن آلود کرنے کے مرتکب ہو رہے ہیں، ان کا یہ نظریہ کہ 'اسلام صرف تزکیۂ نفس سکھلاتا ہے باقی اُسے دُنیوی امور میں کوئی دخل نہیں' کو مولانا سلیمان اشرف نے اُس 'جہلِ مرکب[1]' کی بنا قرار دیا ہے، جس کا تذکرہ قبل ازیں ہم کر چکے ہیں۔

یہاں اس بات کا دھیان رہے کہ یہ مذہبی تنظیمیں لوگوں کو اپنی جانب راغب کرنے کے لیے بین الاقوامی (انٹرنیشنل) جیسے مسحور کن لاحقہ کے ساتھ اپنے اوپر غیر سیاسی ہونے کا اطلاق کرتی ہیں، ان کا خیال ہے کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد کے بقول 'خیال' کی عظمت سے کسے انکار ہے؟ قوموں کی آبادی و بربادی اسی 'خیال' کی کج روی و راست روی پر منحصر ہے۔ لیکن یہ خیالات ان لوگوں کے ہیں جو اپنی تحریک کے ذریعے ایک ہمہ گیر انقلاب کے داعی ہیں۔ بعض سادہ دل ہم وطن اور کم لکھے پڑھے، مذکورہ تنظیموں کے پروپیگنڈے کو حقیقت سمجھنے لگے ہیں، ان کی تبلیغ کیا رنگ لا رہی ہے؟ یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا راقم ضروری سمجھتا ہے، جس سے ایک ایسے انداز فکر کی نشان دہی ہوتی ہے، جو نہ صرف گمراہ کن، سراسر غلط بلکہ خلاف سُنّت بھی ہے۔

۱۹۷۵ء میں مکتبہ رضویہ گجرات کی جانب سے ایک کتابچہ ''اعلیٰ حضرت بریلوی کی سیاسی بصیرت'' (مولفہ سید نور محمد قادری) کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۸۶ء میں اسے انجمن فدایانِ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کھاریاں نے طبع کروایا تو کارپردازان انجمن نے مذکورہ عنوان سے لفظ سیاسی حذف کر کے اپنی تسکین کا سامان کیا اور اسے ''امام احمد رضا کی بصیرت کے چند مناظر'' کے عنوان سے شائع

---

[1] جہل مرکب (ع) مذکر و مونث۔ ''دو جہالتیں یعنی ایک تو جاہل ہونا، دوسرے اپنے آپ کو عالم و فاضل سمجھنا۔'' (قائد اللغات)۔ ''ایک مرض نفسانی جس میں انسان باوجود عدم علم اس امر کے علم سے بھی ناواقف ہوتا ہے کہ وہ ناواقف ہے بلکہ خلاف واقع اپنے حق میں عالم ہونے کا یقین رکھتا ہے گویا دو جہلوں (عدم علم اور ناواقفیت عدم علم) میں مبتلا ہونا جہل مرکب ہے۔'' (نور اللغات)

کیا، استفسار کیا گیا تو ارشاد ہوا کہ ہم غیر سیاسی لوگ ہیں، ہمارا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

نظام اسلامی یا اسلامی فکر سے غفلت کی یہ ایک مثال ہے۔ اس طرح اور بھی باتیں مشاہدہ میں آتی ہیں، جن کا حقیقت اور واقعیت سے دور کا واسطہ نہیں ہوتا، مگر انہیں فکر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اب آپ ہی انصاف سے بتائیں کہ وہ لوگ جنہیں خلافت و معارف اسلامی کا قطعاً علم نہ ہو، وہ تبلیغ و ہدایت کے علم بردار بنیں، پھر خود ہی سواد اعظم کے ترجمان بن بیٹھیں اور اہل سنت کے امیر یا سربراہ کا لقب اختیار کر لیں تو کیا کوئی عقل سلیم اسے تسلیم کرے گی؟ اکابر علمائے احناف نے کبھی بھی ایسی بے بصیرتی کا مظاہرہ نہیں کیا، اور نہ ہی انہوں نے دین کو اشخاص میں بانٹ کر (کہ جس سے دین کی بنیادی حرارت ہی جاتی رہے) مسلمانوں کے شیرازہ کو بکھیرنے کی سعی کی ہے؟ ع

کاش! "تبلیغی نصاب اور فیضان سنت" کے مرتبین نے الموت الثانی النساب فی العہدی السوی و الخلافۃ الراشدہ (یہ عہد نبوی کی سیاسی و انتظامی بات کا ایک جامع ترین مجموعہ ہے) اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی دوسری کتاب "رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی" کا مطالعہ کیا ہوتا۔ "فیضان سنت" اور ایسے ہی دوسرے رسائل میں فقہ حنفی کی مشہور کتاب بہار شریعت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ امیر دعوت اسلامی نے اپنے معتقدین و متوسلین کو بہار شریعت پڑھنے کی تلقین کی ہے، یہ تلقین بجا اور خوش آیند۔ لیکن کیا صاحب بہار شریعت مولانا حکیم محمد امجد علی قادری (م۔

نوٹ اول میں ہم کتب لغت سے ان دونوں الفاظ کے معنی نقل کر چکے ہیں۔

سیاست: طریق حکمرانی، حکومت کرنے کی حکمت عملی، انتظام حکومت کا نظام، رائے، تدبر، حسن کار، داری، امور ملکی کا سرانجام، کاروبار حکومت۔ (جدید اردو سیاسیات میں کشور کاری کی فراست و علمیت)

سیاسی: یہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ملکی انتظام سے متعلق، سیاست سے نسبت رکھنے والی چیز، امور سیاست کا جاننے والا، ہوشیار، زیرک۔ (یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ جماعت رضائے مصطفےٰ پاکستان کے امیر مولانا محمد شاہد صاحب (کراچی) نے امیر دعوت اسلامی کا خود کو امیر جماعت کا لقب اختیار نہ کرنے کی وجہ بتائی ہے۔

۱۹۳۸ء) کے اس ایمان و اعتقاد پر بھی غور فرمانا چاہیے یا نہیں؟ جو ان کے تاریخی سوال نامہ بعنوان اتمام حجت نامہ (۱۳۳۹ھ) جو اس اختصار کی صورت نمایاں نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی سیاست دین ہی ہے یا اس سے الگ؟[1]

واضح رہے کہ نبی کریم ﷺ سے پہلے بھی انبیاء کرام ہی سیاسی اور معاشرتی معاملات میں لوگوں کی راہ نمائی کرتے تھے۔ امام بخاری نے اپنی الجامع الصحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کا مندرجہ ذیل ارشاد (جسے امام مسلم نے بھی بیان کیا) نقل کیا ہے۔

کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء علیهم السلام کلما هلك نبیٌ خلفه نبیٌ و انه لا نبی بعدی و سیکون خلفاء فیکثرون الخ

(آنحضور ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کے سیاسی اور انتظامی معاملات کی نگرانی انبیاء کرتے تھے جب ایک نبی فوت ہو جاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین بن جاتا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ میرے بعد صرف میرے خلفاء ہوں گے جن کی تعداد زیادہ ہو گی یعنی حکومت و سیاست کی ذمہ داری انہی پر ہو گی" (تفہیم الاصول جلد ۲ صفحہ ۳۵)

یہ وہ ایک اس بات پر دلیل محکم ہے کہ سیاست کو دین سے جدا سمجھنے کا نظریہ ہرگز اسلامی نہیں، ایسے طرز فکر سے اسلام ابا کرتا ہے، اور علماء اسلام کو لوگوں پر حکومت و سیاست کا حق دے رہا ہے اس لیے مسند ارشاد پر فائز اہل علم اور فقہاء اسلام کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کے ملکی اور سیاسی معاملات کی قیادت کریں تاکہ لوگوں کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں بالفعل قانون کی عمل داری قائم ہو۔

حضرت سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فاضل تلمیذ جناب غلام غوث صدانی (۱۸۸۹ء۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء) بلیگ کی گرہی قدر کتاب "مثنوی صدانی" موضوع ہی نہیں،

---

[1] شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ، صفحہ ۱۰۔

[2] الواعظ آزاد کی تاریخی خدمات (مرتب) الحاج جمال الدین انصاری، مطبوعہ لاہور ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۔

زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ موقع کی مناسبت سے اس مثنوی سے ایک نظم بعنوان 'دین و سیاست' ملاحظہ فرمائیں۔

گاہ خواہی از سیاست دین جُدا — وای بر تدبیرِ طبع نارسا
ای ز دین بیگانہ و حق ناشناس — دینت الحاد و سیاست بی اساس
ای اسیرِ طمطراقِ ظاہری — نیست مقصود تو غیر از قاہری
تا زِ دینِ حق تخلّف برملاست — در سیاست کربلا در کربلاست
از سیاست گر کُنی دین را بدر — چوں کُنی خود خواہی از دِلہا بدر؟
دین چو رخصت شُدزِ ایوان و سریر — با کہ بسپاری قلمدانِ ضمیر؟

ترجمہ:

۱۔ اگر تُو چاہتا ہے کہ سیاست اور دین جُدا ہوں، تو تیری اس طبع نارسا کی تدبیر پر افسوس ہے،
۲۔ اے دینِ حق سے بیگانہ اور حق کو نہ پہچاننے والے تیرا دین الحاد ہے اور تیری سیاست بے بنیاد ہے،
۳۔ اے تُو جو کہ ظاہری کرّ و فر کا قیدی بنا ہوا ہے، تیرا مقصد اس سے قاہری کے علاوہ کچھ نہیں،
۴۔ جب تک دین حق کی برملا خلاف ورزی کی جاتی رہے گی، اس وقت تک سیاست میں تو کربلا کے اندر کربلا ہے،
۵۔ اگر تُو سیاست سے دین کو نکال دے گا، تو ایسے ہی ہے جیسے تُو خود کو دوسرے کے دلوں سے نکال دے،
۶۔ دین کو جب بادشاہی ایوانوں سے رخصت کر دیا گیا تو پھر اپنے ضمیر کے قلم دان کو کس کے سپرد کرے گا؟

ہم نے اوپر کی سطور میں اُمّت کے جسدِ اجتماعی کو لاحق جن عوارض کا ذکر کیا ہے، وہ بلاشبہ اپنے معاشرہ کے لیل و نہار کو سامنے رکھتے ہوئے نوکِ قلم پر لائے ہیں، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جو مناظر ہم اپنے گرد و پیش دیکھتے ہیں، اُن کا نظارہ ہمارے دینی بھائی اپنے اپنے ملکوں میں ٹھیک اس طرح کرتے ہیں، جیسے اہلِ دل یہاں کبیدہ خاطر اور ملول ہوتے ہیں بعینہٖ دوسرے

مسلمان ملکوں کے دردمند خواتین وحضرات بھی خون کے آنسو روتے ہیں۔

ماضی قریب بلکہ عہد حاضر کا واقعہ ہے کہ ایران میں امریکی مفادات کے نگہبان، آریہ مہر رضا شاہ پہلوی کی عیاش اور ظالم حکومت کا تختہ اسلامی فکر کے، پیام بر علمائے دین نے عوامی قوت سے اُلٹا اور لوگوں کے نظریۂ حیات میں عملی انقلاب برپا کر دیا۔

یہ درویش صفت لوگ جو نعرہ لے کر اُٹھے وہ محض نعرہ نہ تھا۔ اُن کی فکر، ان کی زبان اور اُن کا عمل سب ہم آہنگ و یک رنگ تھے۔ یقین مانیے انقلاب محض وعظ و نصیحت اور خوب صورت نعروں سے برپا نہیں ہوا کرتے۔ دعوت پر لبیک کہنے والے سب سے پہلے داعی کے عمل اور کردار کو دیکھتے ہیں۔

بعض معاملات میں ہم، ایرانی علمائے کرام کے نظریات یا خیالات سے اختلاف بھی رکھتے ہوں گے، لیکن اسلامی انقلاب کے عملی نفاذ کے لیے اس عظیم تحریک سے استفادہ نہ کرنا ایک بڑی کوتاہی ہوگی۔ ملّت کے عظیم تر مفاد میں بعض اختلافات کو ہرگز سنگِ راہ نہ بننے دیا جانا چاہیے۔

ذیل میں ہم ایرانی انقلاب کے بانی علامہ امام روح اللہ موسوی خمینی کی کتاب الحکومۃ الاسلامیہ (اردو ترجمہ: محمد نصر اللہ خان خازن مجددی) کے بعض حصوں کا مفہوم اور چند اقتباس نقل کر رہے ہیں، آپ خود ملاحظہ فرمایئے کہ ہمارے اور ان کے حالات کس قدر مماثل اور حیرت انگیز طور پر یکساں نظر آتے ہیں۔ انصاف سے کہیے گا کہ کیا ہم اس عظیم انقلاب کو مثل قندیل استعمال کرتے ہوئے اپنے لیے روشن راہیں متعین نہیں کر سکتے؟

ا۔ حقیقی اسلام اور ظاہری اسلام کا فرق

مَیں چاہتا ہوں کہ حقیقی اسلام اور اس اسلام کے درمیان جو عوام کے ہاں معروف ہے، فرق واضح کرنے کے لیے آپ کی توجہ اس فرق کی طرف مبذول کروں، جو ایک طرف قرآن اور کتب حدیث میں اور دوسری طرف قرآن و حدیث اور موجودہ فقہی کتب میں موجود ہے۔ قرآن

اور حدیث دونوں اسلام میں قانون سازی کے اہم ترین ماخذ ہیں جو فقہ کی ان کتب سے نمایاں طور پر مختلف ہیں جو فقہاء و مجتہدین نے بعد کے ادوار میں تالیف کی ہیں۔ اس لیے کہ قرآن اور کتب حدیث میں زندگی کے جملہ پہلوؤں پر جامع ہدایات ملتی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیے اجتماعی مسائل سے تعلق رکھنے والی آیات اُن آیات سے کئی گُنا زیادہ ہیں، جن کا تعلق محض عبادات سے ہے۔ دوسری طرف آپ حدیث کے بڑے بڑے مجموعوں کو ملاحظہ کریں، کسی ایک میں بھی عبادات اور انسان کے تعلق باللہ سے بحث تین یا چار ابواب سے زیادہ نہ ہوگی۔ چند ابواب اخلاقیات کے لیے مختص ہوں گے، ورنہ اس کے علاوہ ان مجموعہ ہائے حدیث کا بہت بڑا حصہ اجتماعی اور معاشی مسائل، حقوق انسانی، مملکت کے انتظامی امور اور قیامِ امن و انصاف کے لیے دیوانی اور فوجداری قوانین پر مشتمل ہے۔

مَیں نوجوانانِ اسلام سے کہتا ہوں کہ آپ اسلام کے سپاہی ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کریں اور تحریر و تقریر اور سیرت و کردار میں سے جو وسائل بھی آپ کو میسر ہوں اُن کے ذریعہ اسلامی قوانین اور اسلامی نظام کے تمام شعبوں سے لوگوں کو متعارف کرائیں، اسلامی نظام کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں موجود شکوک و شبہات کو دور کرنے کی سر توڑ کوشش کریں۔ اس مقصد کے لیے اپنی پوری زندگیاں وقف کر دیں، لوگوں کو سمجھائیں کہ اوّل روز سے اسلام کو بہ حیثیت نظامِ زندگی نافذ کرنے میں کون سی مشکلات اور رکاوٹیں درپیش ہیں۔ وہ کون سی قوتیں ہیں جو شروع سے اس کی مزاحم ہیں، جن حقائق کا آپ کو علم ہے، وہ بلاکم و کاست لوگوں تک پہنچائیں۔ لوگوں کو دین کی دعوت اس انداز سے نہ دیں کہ وہ یہ سمجھ بیٹھیں کہ اسلام بھی موجودہ عیسائیت کی طرح کا ایک مذہب ہے، جس میں صرف فرد کا رشتہ خدا سے قائم کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور بس۔ یا یہ کہ مسجد اور کلیسا دونوں برابر ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔[1]

---

[1] امام خمینی۔ دعوت تحریک اور افکار اردو ترجمہ: محمد نصر اللہ خان خازن مجددی، (مرتبہ) سید اسعد گیلانی، ص ۷۱، ۷۲

۲۔ اقامتِ دین اور ہماری ذمہ داری

اسلامی حکومت کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ آپ آگے بڑھ کر عوام میں اسلامی حکومت، اسلامی دستور اور اسلامی قوانین کی وسیع پیمانے پر بلا کم و کاست تبلیغ و تشہیر کریں، اسلامی حکومت کے قیام کا فریضہ بلا خوف لومۃ لائم پوری تن دہی اور خود اعتمادی کے ساتھ انجام دیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر عائد کردہ فرض ہے، اسی کو توفیق و نصرت کی امید پر اس کی ادائیگی میں اپنا سب کچھ لگا دیں۔

استعماری قوتیں گزشتہ تین صدیوں سے اپنی تیاری میں مصروف ہیں۔ انہوں نے صفر سے آغاز کیا تھا اور اب وہ اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ آج ہمیں بھی صفر سے آغاز کرنا ہے۔ اہل مغرب اور ان کے آلۂ کار کو اب مزید مہلت نہ دیں۔ عوام کو اسلام سے روشناس کرائیں تاکہ نوجوان نسل یہ نہ سمجھے کہ علمائے اسلام نجف اور قم کے گوشہ ہائے عزلت میں بیٹھے دین کو سیاست سے علاحدہ سمجھتے ہیں اور انہیں حیض و نفاس کے مسائل کے سوا اور کسی چیز میں مہارت نہیں ہے، سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں نہ سیاسی اور نہ اجتماعی مسائل میں درک حاصل ہے، نہ ان میں یہ اہلیت ہے وغیرہ وغیرہ۔ [1]

۳۔ دین و سیاست کی تفریق طلسم سامری

تمام استعماری طاقتوں نے ساری دنیا میں یہ وسوسہ ڈال رکھا ہے کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ معاشرے کی اجتماعی زندگی میں روحانی اقدار کی چنداں ضرورت نہیں ہے، نہ علماء و فقہاء ہی کا یہ حق ہے کہ وہ امت کی آزادی و استقلال کے لیے کوئی سعی و عمل کریں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم میں سے اکثریت اس غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈا کا شکار ہو گئی ہے۔ ہماری اس فریب خوردگی نے استعماری طاقتوں کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔

---

[1] امام خمینی۔ دعوت تحریک اور افکار۔ بار اول، اسلامک انٹرنیشنل پبلشرز، لاہور سنہ ندارد، ص ۸۴، ۸۵

تھوڑی دیر کے لیے آپ اپنی دینی تنظیموں پر نگاہ ڈالیں ۔ آپ کو وہاں اس پروپیگنڈے کے ہوش رُبا اثرات صاف نظر آئیں گے۔ آپ کو بڑی تعداد میں انتہائی کم ہمت اور کاہل لوگ ملیں گے، جو صرف دعاؤں اور وظیفوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں یا مذہبی مسائل پر رٹی رٹائی تقریروں اور بے اثر وعظ و نصیحت کو ہی مقصدِ حیات گردانتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک ان کا مقصدِ وجود اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان حالات میں اور ایسی فضا میں یہ نغمہ کیا برمحل نہیں ہے۔

سُنو مغرب سے ہے آیا یہ پیام — سیاست میں ہے دجل اور اتہام
دخل اس میں اہلِ دیں کو ہے حرام — یہی ہے بس اہلِ دیں کا جب مقام
زباں پر ہو "لاالٰہ" ذکر مدام — نہ ہو عالم کو کبھی اس میں کلام

یہ افیونی انداز فکر یقیناً غلط اور خلافِ اسلام ہے۔[1]

۴۔ دین و سیاست میں علاحدگی کیوں؟

استعمار نے ہمارے نصابِ تعلیم میں یہ بات بڑی ہوشیاری کے ساتھ داخل کر دی ہے کہ دین کا حکومت اور ملکی مسائل سے الگ رہنا آج کے دور میں انتہائی ضروری ہے۔ مَیں پوچھتا ہوں۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عہدِ مبارک میں دین سیاست سے علاحدہ تھا! کیا اس زمانے میں کچھ ماہرینِ دین تھے اور کچھ ماہرینِ سیاست؟ اور پھر کیا خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں اور پھر کیا حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں سیاست دین سے علاحدہ تھی؟ اور کیا اس مبارک زمانے میں دین کا ڈھانچہ الگ اور سیاست کا الگ تھا؟

غیر ملکی استعمار اور نظامِ باطل کے علم بردار یہ پروپیگنڈا دین کو انسان کی اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل سے الگ رکھنے کے لیے کرتے ہیں۔ ضمناً وہ علمائے اسلام کو عوام سے دور اور عوام کو علما سے الگ تھلگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ علما مسلمانوں کی آزادی و استقلال کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اگر دین کو سیاست و حکومت سے بُدار رکھنے کی کوشش کامیاب ہوتی ہے تو وہ بہ آسانی

---

[1] امام خمینی۔ حکومت تحریک اور انقلاب اردو ترجمہ۔ محمد نصر اللہ خان خازن مجددی، (مرتبہ) سید اسعد گیلانی ص ۲۲۷، ۲۲۹

ہماری دولت و ثروت بھی لوٹتے ہیں اور ہم پر حکومت بھی کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہمارا مقصدِ زندگی صرف نمازیں پڑھنا، دعائیں مانگنا اور خدا کا ذکر کرنا ہی ہو اور اس سے زیادہ کچھ نہ ہو تو یقین جانیں استعمار اور استعمار پرستوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں نماز پڑھیں جب چاہیں اذان دیں۔ اور اللہ جتنا ثواب دے وہ لیتے جائیں۔ ثواب کتنا اور کیا ہوگا، اس کا حساب اللہ کے ذمہ رہنے دیں۔ اللہ کے سوا طاقت و توفیق کا مالک اور کون ہے؟ موت کے بعد ہمارا اجر اللہ کے ذمہ ہے، جب ہماری سوچ ہی یہ ہو تو پھر نہ ہم پر کوئی ذمہ داری ہے نہ ہمیں کسی باز پرس کا کوئی اندیشہ! کیا دین کا تقاضا صرف یہی ہے اور بس!

ایک دفعہ عراق میں برطانوی استعمار کے ایک افسر نے جب اذان سُنی تو اس نے دریافت کیا۔ ''برطانوی سیاست کو اس سے کیا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے؟'' اسے بتایا گیا کہ ''اس سے کوئی خطرہ نہیں'' اس نے جواب دیا۔ ''اچھا! تو پھر جو کچھ یہ کہہ رہا ہے، اسے کہنے دو، اور جب تک جی چاہے کہتا رہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' یہ ہے ان کا اندازِ فکر! جب تک آپ استعمار کی سیاست میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں اور علمی دائرے میں رہ کر دینی علوم کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہیں تو آپ سے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ جتنی چاہیں نمازیں پڑھیں اور جتنا چاہیں اللہ کی یاد کرتے رہیں۔ انہیں تو صرف آپ کے تیل کے ذخائر (پٹرول) سے غرض ہے۔ آپ کی نمازوں سے انہیں کیا کام؟ انہیں تو آپ کے معدنی ذخائر درکار ہیں۔ ہمارے ملک میں انہیں اپنے مال کی منڈی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ملک میں ایسی کٹھ پتلی حکومتیں دیکھتے ہیں جن کی نظر صرف ملک کی صنعتی ترقی پر ہے۔ انہیں دولت سمیٹنے کے لیے صرف کارخانے درکار ہیں اور بس! غیر ملکیوں کی یہ خواہش ہے کہ ہم بااصول و باضمیر انسانوں کے معیار تک نہ پہنچنے پائیں۔ کیونکہ انہیں باضمیر اور بااصول انسانوں سے خوف آتا ہے، جب وہ کسی جگہ کسی باضمیر و بااصول انسان کو دیکھ لیتے ہیں تو اس سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں کیوں کہ یہ شخص سب سے نمایاں اور سب کا منظورِ نظر ہوتا ہے، اس کی سیرت و کردار کے اندر اتنی جاذبیت ہوتی ہے کہ پورے معاشرے کو

اپنی پُرکشش شخصیت سے متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ اگر ایسے شخص کی قیادت وراہ نمائی میں لوگ اُٹھ کھڑے ہوں تو وہ عمارت ہی دھڑام سے زمین بوس ہو جائے جس کی تعمیر پر دشمن نے ایک طویل عرصہ صرف کیا ہوتا ہے۔ ظلم وجور اور خیانت وغداری کے پاؤں تلے سے زمین کھسک جائے۔ لہٰذا جب کوئی با اصول و باضمیر انسان انہیں نظر آتا ہے، وہ اس کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اور کرائے کے قاتل حاصل کرتے ہیں، یا ناکامی کی صورت میں اس کی وطن دشمنی کا ڈھنڈورا پیٹنے لگتے ہیں یا پھر جلاوطن کر دیتے ہیں یا پھر اس پر یہ تہمت چسپاں کر دیتے ہیں کہ یہ سیاسی آدمی ہے۔ یہ سیاست باز عالم ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیاسی نہ تھے؟ کیا آپ نے سیاست میں حصہ نہ لیا۔ کیا سیاست میں حصہ لینا کوئی عیب ہے؟

یاد رکھیں یہ سب باتیں دشمنانِ اسلام اور ان کے کارندوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ ان کے پیش نظر سوا اس کے کچھ نہیں کہ آپ کو قومی سیاست سے، ملکی مسائل سے اور اجتماعی معاملات میں حصہ لینے سے باز رکھیں، وہ یہ چاہتے ہیں کہ آپ ظالم وخائن اور عوام کا خون چوسنے والے حکمرانوں کو کرسیِ اقتدار سے نہ ہٹالیں، بلکہ ان کی کوشش یہ ہے کہ ان کی من مانیوں کے لیے فضا ہموار رہے اور وہ جس طرح چاہیں کریں، جہاں چاہیں دندناتے پھریں لوگوں کی جان و مال اور عزت وآبرو جب چاہیں لوٹیں اور کوئی انہیں روکنے اور ٹوکنے والا نہ ہو۔ [1]

۵۔ نام نہاد علم بردارانِ تقدس کی اصلاح

عقل وخرد سے عاری افکار جو دشمنوں نے کمال چابک دستی کے ساتھ ہمارے قومی وجود میں انجیکٹ کر دیے ہیں، وہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ کا باعث ہیں۔ ہم میں سے ایک خاصی بڑی تعداد ان افکار کی گرویدہ ہے۔ بدقسمتی سے ان افکار کے علم بردار اپنے آپ کو مقدس اور پاک باز لوگوں کی جماعت کہلوانا پسند کرتے ہیں اور پھر سادہ لوح لوگوں کی بھی ہرگز کمی نہیں، جو ان کے ہاتھ چومنا سعادت سمجھتے ہیں، حال آنکہ یہ مقدس لوگ نہیں ہیں بلکہ انہوں نے نام نہاد تقدس کا لبادہ اوڑھ

---

[1] امام شکی۔ دعوت، تحریک اور افکار اردو ترجمہ: محمد نصر اللہ خان خازن مجددی، (مرتبہ) سید اسعد گیلانی، ص ۸۵۔۸۷

رکھا ہے۔ ہماری ذمہ داری یہ بھی ہے کہ ہم اس فریب کا پردہ چاک کریں اور ان لوگوں کی اصلاح کی بھی فکر کریں۔ اس گروہ کے بارے میں ہمیں اپنی پالیسی متعین کرنی چاہیے کیونکہ یہ ہمارے راستے کا روڑا ہیں۔ احیاءِ دین، اصلاح معاشرہ اور ارتقاء انسانیت کا جو پروگرام ہمارے پیش نظر ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس رکاوٹ کو دور کریں۔

ایک روز کی بات ہے مرحوم آیت اللہ بروجردی[1]، مرحوم آیت اللہ الحجۃ، مرحوم آیت اللہ الصدر اور مرحوم آیت اللہ حوانساری ایک سیاسی مسئلے پر غور و فکر کے لیے میرے غریب خانہ پر جمع تھے۔ مَیں نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ ان نام نہاد مقدسین کے بارے میں اپنی پالیسی طے کریں۔ اور انہیں اپنا اندرونی دشمن تصور کریں، کیونکہ یہ لوگ علماءِ حق کی طرف سے کیے گئے فیصلوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ یہ علماءِ حق اور اعیانِ حکومت کے درمیان منافقانہ چال چلتے ہیں اور معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ [2]

۶۔ نام نہاد پیری جمود و ذلت کا شاخسانہ

درحقیقت یہ اسلام کے چہرے پر کالک پوتنے کی کوشش ہے جو محض مکروہ فعل ہی نہیں، حد درجہ خطرناک بھی ہے۔ یہ اسلام کی انتہائی مسخ شدہ تصویر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس

---

[1] تحریک پاکستان کے معروف مجاہد، مولانا عبدالحامد قادری بدایونی (م۔ ۲۱ر جولائی ۱۹۷۰ء) ''ممالک عربیہ اور ایران کے سفرنامہ'' مطبوعہ ۱۹۶۱ء میں رقم طراز ہیں۔

''چنانچہ سب سے پہلے ہم لوگ 'قُم' گئے۔ قُم، تہران کا سب سے بڑا علمی مقام ہے، جہاں علامہ بروجردی کی زیرنگرانی ایک عظیم الشان دارالعلوم اور ایک شاندار مسجد تیار ہوئی، جہاں لاکھوں روپیہ طلبہ و مدرسین پر خرچ کیا جاتا ہے۔''

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مولانا بدایونی مرحوم نے یہ دورہ بہ حیثیت صدر مرکزی جمعیت علماء پاکستان، بسلسلہ تحریک حفاظت و بحالی مقابر و مزارات، علمائے ایران سے تعاون حاصل کرنے کے لیے کیا۔ قائد ملت اسلامیہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی قدس سرہ العزیز (م۔ ۱۱ر دسمبر ۲۰۰۳ء) اور مولانا عمر الٰہی دہلوی بھی ان کے ہم رکاب تھے۔

[2] امام خمینی۔ دعوت، تحریک اور افکار (اردو ترجمہ: محمد نصراللہ خان خازن محمدی، (مرتبہ) سید اسعد گیلانی، ص ۲۲۹۔۲۳۰

گروہ کی خاصی بڑی اکثریت نجف، قم اور خراساں کی دینی درس گاہوں میں موجود ہے۔ اور جاہل اور بے شعور عوام پر اُن کا بہت بڑا اثر ہے، جو بندۂ خدا عوام کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے نعرۂ حق بلند کرتا ہے یہ لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور عوام کو طفل تسلیاں دے کر جمود اور ذلت کی زندگی اختیار کرنے پر مائل کرتے ہیں، جو شخص بھی انگریزوں اور امریکیوں کے اثر ونفوذ کی مخالفت کرتا ہے یہ لوگ خم ٹھونک کر اس کے مقابلے میں کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔

ہمارا فرض ہے کہ اوّل تو ہم ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں اسلام اور اہلِ اسلام کو ان کے طرزِ عمل سے جو عظیم خطرہ لاحق ہے اس سے انہیں متنبہ کریں ان کی آنکھیں کھول کر انہیں وہ خطرہ دکھائیں جو یہودیوں اور اینگلو امریکیوں کے ہاتھوں اسرائیلی سامراج کی صُورت میں ہماری اجتماعی زندگی کو درپیش ہے۔

میرے عزیز! خدارا نورِ خدا کو نہ بجھائیں اور عیسائیوں کی طرح ضلالت اور گمراہی کی تاریکیوں میں نہ کھو جائیں۔ تثلیث (خداوند یسوع مسیح اور مریم) روح القدس، باپ اور بیٹا وغیرہ کے مسائل میں وہ ایسے اُلجھے کہ دینِ حق کی کوئی دوسری بات ان کے ہاں باقی نہ رہی۔ خدارا ہوش میں آئیں اور حقائق کو ان کی اصلی شکل میں دیکھیں جیسا کہ وہ ہیں۔ آج اور کل کے درپیش اجتماعی مسائل کا جائزہ لیں اور ان کے حل کی تدبیر سوچیں۔ کیا آپ کو توقع ہے کہ اس حال میں جس میں کہ آپ اس وقت ہیں فرشتے احتراماً آپ کے قدموں کے نیچے اپنے پَر پھیلائیں گے۔ کیا ان کے لیے آپ کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے؟ فرشتے اگر اپنے پَر حضرت امیر المومنینؑ کے قدموں کے نیچے بچھاتے تھے تو وہ محض اسلام کے لیے آپ کی خدمات، راہِ حق پر آپ کی پہل اور ساری دنیا میں اسلام کی اشاعت کے لیے آپ کی سعی کی وجہ سے بچھاتے تھے۔ خدا کے فرشتے آپ کے سامنے جھک جاتے تھے۔ لوگ بھی آپ کے سامنے جھک جاتے۔ حتیٰ کہ دشمن بھی آپ کے حکم کے سامنے جھک جاتے تھے۔ وہ دراصل اس حق کے سامنے جھکتے تھے جو آپ کی نشست و برخاست میں، آپ کی خاموشی اور کلام میں آپ کی نماز اور خطبے میں اور آپ کی صلح و جنگ میں کارفرما تھا۔ آپ ہی

بتائیں آپ اس میں سے کس قسم کی تعظیم کے مستحق ہیں؟ یقیناً کسی کے بھی نہیں!

ہم ان نام نہاد پاک بازوں سے یہی بات کہنا چاہتے تھے۔ کاش کہ ہماری یہ نصیحت انہیں کوئی فائدہ پہنچائے۔ یہی ہمارا مقصود ہے۔ ورنہ ہم ایک دوسری جگہ ان سے نمٹ لیں گے۔ وہ جگہ بھی اور ہوگی۔ اور ہمارا ان کا حساب بھی اور ہوگا، جبکہ ہم سب احکم الحاکمین کی عدالت میں کھڑے ہوں گے۔ [1]

۷۔ اسلام کے خلاف یہودیوں کی فکری یلغار

تحریک اسلامی کو ہمیشہ یہودیوں کے ہاتھوں ابتلاء و آزمائش سے گزرنا پڑا ہے۔ یہودیوں نے اوّل روز ہی سے اسلام کے خلاف اپنی معاندانہ سرگرمیاں جاری کر رکھی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اسلام کی اعلیٰ دعوت اور پاکیزہ تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ اس کے خلاف تعصب و افترا پردازی کے تیر برسائے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ماضی میں ایک طویل دور ایسا گزرا ہے جس میں بہت سی ایسی جماعتیں اور ایسے گروہ عالم ظہور میں آئے جنہوں نے اسلام کی ہیئت اجتماعی اور تنظیم سیاسی کو اتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے جو شیطان اور اس کی ذریت کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

یہ وہ دور ہے، جس میں استعماری طاقتوں نے ہر طرح کی گمراہی اور ضلالت سے لیس ہو کر عالم اسلام پر حملہ کر دیا۔ اور اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے ایسے حالات پیدا کیے جن میں اسلام کی تمام اقدار کو ملیامیٹ کیا جا سکے۔ گزشتہ تین صدیوں سے استعماری طاقتوں کی یہ مساعی اپنے عروج پر ہیں۔ بظاہر یہ طاقتیں اپنی سرگرمیاں مسلمانوں کی اجتماعی فلاح و بہبود کے نام پر جاری رکھے ہوئے ہیں، لیکن فی الحقیقت ان کے پیش نظر مسلمانوں کی معاشی زندگی میں ان کی مدد کرنا نہیں ہے، نہ ہی وہ مسلمانوں کی مخلصانہ امداد کرنا چاہتی ہیں۔ بلکہ وہ تو مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے ان میں نظریاتی اور سیاسی اثر و نفوذ چاہتی ہیں، کیوں کہ انہوں نے صلیبی جنگوں کے زمانہ ہی سے یہ حقیقت

---

[1] امام خمینی۔ دعوت، تحریک اور افکار اردو ترجمہ: محمد نصر اللہ خان خازن مجددی، (مرتبہ) سید اسعد گیلانی، ص ۲۳۰۔۲۳۱

اچھی طرح سمجھ لی ہے کہ ان کے مقاصد کی تکمیل میں جو سب سے بڑی رکاوٹ حائل ہے اور جس کی وجہ سے ان کی سیاسی عمارت ریت کے ڈھیر پر کھڑی ہے وہ اسلام ہے، جس کی سیاسی و معاشرتی تعلیمات، جس کے اجتماعی و معاشی احکام اور جس کے دینی عقائد و نظریات ان کے افکار و نظریات کے بالکل ضد ہیں۔ نیز ان کے سد راہ بننے والی چیز جذبۂ ایمان ہے جو اہل اسلام کے دلوں میں موج زن ہے۔ محض اسی لیے وہ اسلام کے خلاف تشکیک و ریب اور افترا و بہتان کے ہتھیاروں سے حملہ آور ہیں۔ اور عوام کی آنکھوں میں مکر و فریب کی خاک جھونک رہے ہیں۔ اور اسی مقصد کے لیے یہ استعماری طاقتیں عیسائی مشنریوں، مستشرق محققین اور ذرائع ابلاغ پر پانی کی طرح روپیہ بہا کر ان کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہیں۔ یہ سب لوگ ان استعماری قوتوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ ان کا ملجائے مقصود سوا اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ لوگوں کے سامنے اسلام کے حقائق کو مسخ کر کے اور اس کی تعلیمات میں تحریف کر کے پیش کیا جائے تاکہ عوام الناس بالعموم اور جدید تعلیم یافتہ لوگ بالخصوص اسلام سے برگشتہ ہو جائیں اور وہ کبھی بھی راہ ہدایت نہ پا سکیں۔

اسلام دراصل ان مجاہدین کا نام ہے جو دنیا میں حق و انصاف کا بول بالا دیکھنا چاہتے ہیں، جو دنیا میں حریت و آزادی کے علم بردار ہیں، جو کفار کو اہل ایمان پر کسی طرح غلبہ پانے کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتے، لیکن اعداء اسلام نے ہمیشہ اسلام کو اس کے بالکل برعکس رنگ میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے عام لوگوں کے ذہنوں میں اس کی مسخ شدہ صورت نقش کی ہے اور علمی مراکز میں تشکیک و ریب کے بیج بوئے ہیں۔ در پردہ ان کا مقصد و حید یہ رہا ہے کہ اہل ایمان کے دلوں میں ایمان کی جو ہلکی سی چنگاری اب تک سلگتی رہ گئی ہے اُسے سرد کر دیں۔ اور ان کے اندر جذبۂ انقلاب ماند پڑ جائے، تاکہ مسلمان دنیا میں ایسی حکومت کے قیام کے ذریعہ اپنی قومی آزادی اور نفاذ شریعت کے لیے سعی نہ کرنے پائیں جو دنیا میں اُن کے لیے عزت و وقار اور سعادت و برکت کا باعث بنے۔ کبھی انہوں نے یہ غلط فہمی پیدا کی کہ معاشرے کی اجتماعی زندگی اور اس کے اجتماعی مسائل سے اسلام کا کوئی تعلق ہے نہ ان مسائل کے حل کے لیے کسی حکومت کے قیام سے کوئی سروکار، بلکہ اسلام تو محض انفرادی زندگی کے

چند مسائل اور چند اخلاقی ضابطوں سے بحث کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ اس طرح کی اہلوات کے بُرے اثرات نہ صرف یہ کہ عوام الناس پر پڑتے رہے ہیں، بلکہ جدید تعلیم گاہوں میں زیرِ تعلیم نوجوان نسل اور طالبانِ دینی علوم بھی اس زہر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نوجوان نسل غلط راہوں پر جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ سچ ہے اسلام آج ہمارے اندر اسی طرح اجنبی ہو کر رہ گیا ہے جس طرح کہ غریب لوگ عوام میں اجنبی بن کر رہ گئے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ ایسی حالت میں داعیانِ اسلام کو دعوتِ اسلامی پیش کرنے میں کتنی مشکل پیش آئے گی، جب کہ استعمار کے کارندوں کی ایک جماعت نے پورے وسائل کے ساتھ اپنی اہلوات سے آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہوگا اور حق کی آواز کان پڑی سنائی نہ دے گی۔ [1]

۸۔ دعوت الی الخیر

آپ کا فرض ہے کہ جہاں آپ لوگوں کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے عبادات کے مسائل بتائیں وہاں آپ لوگوں کو اسلام کے سیاسی اور اجتماعی اصولوں سے بھی آگاہ کریں۔ اسلام کے فوجداری اور دیوانی قوانین کی وضاحت کریں۔ اور اپنی تمام تر جدّ و جہد کا محور و مرکز انہی مسائل کو بنائیں۔ ہمارا فرض ہے کہ آج ہم اسلام کی شرعی حکومت کی بنا ڈالیں۔ لوگوں کو اپنے افکار و نظریات کی دعوت دیں۔ اپنا نقطۂ نظر عام کریں۔ اپنی تعلیمات اور خیالات لوگوں میں پھیلائیں اور زیادہ سے زیادہ اپنے حامی اور معاون تلاش کریں۔ ملک میں جمہور عوام کی منظم سیاسی بیداری اور دینی راہ نمائی کی ایک ہمہ گیر لہر دوڑا دیں تاکہ اس کے ردِ عمل میں تمام مسلمانوں کے اندر اپنے دین سے تمسک کا جذبہ اُبھرے اور وہ پوری تیاری اور جوش و جذبہ کے ساتھ اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ [2]

آج عالمِ اسلام کی بالعموم اور مملکتِ خداداد پاکستان کی بالخصوص حالتِ زار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، اس مردِ حق آگاہ کی بصیرت کو داد دیجیے کہ جس نے سو برس پہلے کچھ ملت فراموش

[1] امام خمینی۔ دعوت تحریک اور افکار: ص ۲۹۔۱۷
[2] امام خمینی۔ دعوت تحریک اور افکار: ص ۲۰۶۔۲۰۷

علتوں کی نشان دہی کرتے ہوئے، ہمارے اس فکری عارضہ کی ٹھیک ٹھیک تشخیص کی، جس کے مطابق ہم اپنا لیڈر ان قوم چند لوگوں کے عوض فکری مفادات کا سودا کرتے اور عوام کالانعام کو بھیڑ بکریوں کی طرح دشمنانِ اسلام کے ہاتھ فروخت کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے۔

چند نمونے مولانا کے اپنے قلم سے ملاحظہ فرمائیں۔

"رشوت ستانی، ملک فروشی، ملت فراموشی ان سب آفتوں میں مبتلا ہو گئے۔ اب یہ ہونے لگا کہ یورپین اقوام سے اعیانِ دولت اسلامیہ اثر قبول لیتے ہیں اور اپنے ملک اور اپنے بھائیوں کو ان کے حوالہ کرتے جاتے ہیں۔ اسلام کو اقوام غیر سے اس قدر جان ستاں صدمہ نہیں پہنچا جیسا خود مسلمانوں کے ہاتھ سے اسے الم کاری لگتا رہا۔ وہ مسلمان ہی تو ہیں جن کی بدولت دولت عباسیہ کا چراغ گل ہو گیا۔ ہندوستان کی یہ ہلاکت زا حالت ہو گئی۔" (الہلال، ج۱، صفحہ ۱۸)

جمہوری دور میں یوسف رضوی اور رسل کائنی کی حوالگی کے عوامل اور ہمارے کارندہ ناک عمل ہو یا مشرف کے عہد آمریت میں سامراج کی کاسہ لیسی کا کردار ادا کرتے ہوئے حساب کم وبیش کے کھیڑوں میں پڑے بغیر ہر مطلب فرد کو اپنے آقاؤں کے قدموں میں لوٹتا دیکھنا۔

ڈاکٹر عافیہ صدیقی جیسی ملت مآب دختر اسلام کے ساتھ امریکی حاکموں کی بدترین بدسلوکی اور انصاف کی گدی پر براجمان منتخب امریکی ججوں کی شرمناک جانب داری اس پر "ال" (الف عین ی) کرنے والا (Poodle) کے سیاہ کارناموں میں شاید سب سے بڑا جرم ہے۔ جس کی سزا کے طور پر دونوں جہانوں میں ذلت اور رسوائی اس کے لئے کا طوق بن کر رہ گئی ہے۔

سیکڑوں گم شدہ افراد کے لواحقین اس "امریکی روبوٹ" کی جان کو رو رہے ہیں، جو غیر اور غیرت نام کی کسی چیز سے آشنا ہی نہ تھا۔ لیکن کیا موجودہ عہد جمہوریت نے کسی تبدیلی کی راہ ہموار کی ہے؟ ۔۔۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ بابائے جمہوریت کے ساتھ ساتھ اسلام آباد کا کچھ حصہ بھی بدل گیا ہے، لیکن کھیل وہی ہے، وہی سکرپٹ، وہی مکالمے اور وہی مکروہ و مغرور کردار۔

آیندہ صفحات میں آپ 'ابلاغ' کی اصل عبارت سے مستفید ہوں گے۔ یہ بے مثل تحریر اپنے عہد میں بھی کسی تازیانے سے کم نہ تھی۔ آج ہمارے حالات پر اس کی تطبیق بھی ہرگز مبالغہ آرائی نہیں ہے، بلکہ یہ بیان خود گویا

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

قائدین کرام، اگر ماشاء اللہ اپنے قلموں تلفظوں سے فرصت پائیں اور عوام الناس خواب غفلت سے سر اٹھائیں تو یہ کتاب آج بھی ایک مشعل کی صورت فروزاں ہے۔

ہے کوئی خلوص دل اور دردمندی کا خریدار؟

ظہور الدین خاں امرتسری

ناشر

ادارۂ پاکستان شناسی

لاہور

۶ ستمبر ۲۰۱۰ء

وما علینا الا البلاغ المبین

(دیباچہ)

مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں جو درد دل رکھنے والے علما تھے ان میں شعبہ علوم اسلامیہ کے سربراہ سید سلیمان اشرف کا اسم گرامی نمایاں ہے۔ مولانا سید سلیمان اشرف ایک جید عالم تھے۔ انہوں نے اپنی کتب کے نام مختصر اور اسلامی رکھے۔ المبین، النور دونوں کتب جناب ظہور الدین امرتسری نے اپنے ادارہ **پاکستان شناسی** سے شائع کردی ہیں جو بڑی مقبول ہوئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تحریریں سادہ ہیں اپنے انداز تحریر میں بھی اور مضامین کے بیان میں بھی۔ وہ کسی گہری علمی بحث میں پڑنے کی بجائے دل سوزی کے ساتھ سیدھے سادے سبھاؤ میں لکھتے ہیں جن کو سمجھنے میں قاری کو ذرا اُلجھن نہیں ہوتی۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی:

> ''المبین'' شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ سر اقبال مرحوم کو بھی بھیجا تھا۔ اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اقبال مرحوم اپنے لکچروں کے سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے۔ کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی ملاقات ہوگئی۔ ''المبین'' کا ذکر چھڑ گیا۔ سر اقبال مرحوم نے بڑی تعریف کی اور فرمایا۔ 'مولانا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے، جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن نہیں منتقل ہوا تھا'۔ گفتگو ہوتے ہوتے ایک ایسا موقع آیا، جب سر اقبال مرحوم نے فرمایا کہ مولانا دوسرے ایڈیشن میں اگر اس بحث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیجیے تو بہتر ہوگا۔''

ظہور الدین صاحب نیشنل بنک سے ریٹائر ہوئے اور حکیم موسیٰ امرتسری کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ حکیم صاحب کا ہی اعجاز تھا کہ ظہور صاحب نے تحریک پاکستان اور مُسلم اُمّہ کا درد رکھنے والے علما کی تحریروں کو شائع کرنے کا بیڑا اُٹھایا تا کہ نئی نسل اپنے اسلاف کے کارناموں سے آگاہ ہو کہ وہ کس طرح سوچتے تھے۔ انہوں نے مولانا حامد بدایونی کی تحریریں بھی مرتب کر کے شائع کیں۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے کہ اپنی جمع پُونجی انہوں نے علمی کاموں پر لگا دی۔ وہ خود کتاب ڈھونڈتے ہیں خود اس کا انتخاب کرتے ہیں۔ خود اسے شائع کرتے ہیں اور ملک بھر میں خود فروخت کرتے ہیں۔ پاکستان شناسی کے حوالے سے جو حقیری خدمت مَیں نے کی ہے اس کی بنا پر اخلاص رکھتے ہیں۔ چنانچہ اب انہوں نے نہایت محنت سے البلاغ تلاش کی ہے جو جلد ہی قارئین کے ہاتھ میں ہو گی۔

کافی عرصہ کی بات ہے مجھے عبدالسمیع اشرف کا ایک فون آیا یہ فون ڈیرہ اسماعیل خان سے تھا۔ عبدالسمیع اشرف فرنٹیئر فورس میں ایک اعلیٰ عہدہ پر متمکن تھے انہوں نے فلسفہ پر میری کتب اشتیاق سے خریدیں اور پڑھی تھیں انہوں نے بتایا کہ وہ مولانا سلیمان اشرف کے خاندان سے ہیں۔ وہ لاہور آ کر مجھ سے ملاقات کے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ میں علامہ سلیمان اشرف پر کام کروں۔ اگر میرا ان سے رابطہ ہوتا تو مَیں انہیں بتاتا کہ ظہور الدین صاحب نے عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ اور وہ ان کی داد کے حق دار ہیں جو کام وہ مجھ سے چاہتے تھے وہ علم کے ایک اور شیدائی ظہور الدین نے کر دیا ہے۔

سید سلیمان اشرف کی یہ کتاب البلاغ ماضی کے گہرے تجزیے پیش نہیں کرتی کہ خلافت کو ملوکیت میں امویوں کے بدلنے سے وہ تحریک ہی دم توڑ گئی جو مدینہ کی ریاست سے شروع ہوئی تھی اور حضرت ابُوبکر صدیقؓ کی فراست نے اور حضرت عمر فاروقؓ کی حکمت و شجاعت نے جسے بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔ شروع سے ہی یہودیوں اور عیسائیوں نے ریشہ دوانیوں کے جال بُن دیے۔ حضرت ابُوبکر صدیقؓ کو زہر آلود خربوزہ کھلا کر شہید کر دیا اور

حضرت عمر فاروقؓ کو ایک ایرانی نے فجر کی نماز کے وقت خنجر مار کر شہید کر دیا اور اسی طرح حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ بھی شہید کر دیے گئے اور یوں قسطنطنیہ کے حکمران قیصر مورق بن ہرقل کی وہ پیش گوئی پوری ہوئی جو مورق نے حضرت امیر معاویہ کو خط کتابت میں لکھی تھی۔ قیصر مورق بن ہرقل نے حضرت معاویہ کو حکومت اور شہادت عثمانؓ کی پیش گوئی کی تھی اور حضرت معاویہ کو اس کی اطلاع دی تھی (تاریخ ابن خلدون جلد دوم ص ۱۶۶) عیسائی حضرت عثمانؓ کو ذھب پر نہ لا سکتے تھے اس لیے انہیں شہید کرنا چاہتے تھے۔ حضرت معاویہ سے انہیں امیدیں تھیں اس لیے انہوں نے عراق میں خوارج سے گڑبڑ کرائی، لیکن شام کو چھوڑ دیا اور حضرت معاویہ کی فوجوں میں بھرتی ہو کر مسلمانوں پر جو ستم وہ توڑ سکتے تھے اس سے انہوں نے گریز نہ کیا۔ حضرت علیؓ سے لڑنے والے جنگ جمل اور جنگ صفین میں بھی یہ شامی عیسائی اور شامی عرب عیسائی تھے، جنہوں نے مسلمانوں کا خون بے دریغ بہایا۔ (محمد یوسف، یزیدی الیوں کا پس منظر، اسلامی تعلیم شمارہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۳)

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ محترمہ سیدہ نائلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے باغیوں کے ہاتھوں اپنی کٹی ہوئی انگلیاں اور خلیفۂ سوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خون آلود کرتا حضرت امیر معاویہ کو بھجوایا تا کہ وہ قاتلینِ عثمان کا بدلہ لے سکیں، جو انتقام کے خوف سے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے جا ملے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے سیدہ نائلہؓ کی خواہش کو زیادہ اہمیت یوں دی کہ اُن کا تعلق بنی کلب سے تھا اور یہ وہ قبیلہ ہے جس کے سردار کی بیٹی میسون (Maysun) حضرت امیر معاویہؓ کے حرم میں شامل تھیں۔ یہ قبیلہ قدیم پامیرا (Palmyra) کے قرب و جوار کے ریگستانوں میں اقامت رکھتا تھا عقیدے کے لحاظ اس قبیلہ کے افراد یعقوبی عیسائی تھے (تاریخ شام فلپ حتی ص ۴۲۵) بنی کلب قبیلہ بھی عیسائی تھا۔ خاندان بھی عیسائی، ماحول بھی عیسائی، خاتون بھی معمولی خاندان کی نہ تھی، بڑے گھرانے کی عورت تھی جس وقت شادی ہوئی حضرت معاویہ کی عمر پچاس سال سے

متجاوز تھی اور اس نصرانیہ کی عمر بیس سال تھی۔ یہ شادی حضرت معاویہؓ کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں ہوئی یہ عورت اپنے مذہب پر اس قدر پختہ تھی کہ مسلمانوں کے حرم، تہذیب و تمدن، علوم دینیہ، وعظ و نصیحت۔ علمائے کرام کے ارشادات، صحابہ اور صحابیات کے کردار نے اس پر کچھ اثر نہ کیا اور وہ آخر دم تک عیسائی رہی (تاریخ طبری جلد دوم حصہ اول ص ۱۴۹، تاریخ شام فلپ حتی ص ۴۲۵ اور بنات الصلیب ص ۱۶۳ از قمر الدین احمد) تاریخ شام میں فلپ حتی لکھتا ہے: حضرت حسینؓ کی شہادت جیسا المیہ ظہور میں آیا جس پر یزید کی حکومت کی عمارت کو منہدم ہو کر خاک میں مل جانا چاہیے تھا، لیکن یہ عیسائیوں کی اکثریت اور پشت پناہی تھی کہ وہ حکومت باقی رہی (تاریخ شام فلپ حتی ص ۴۲۵) یزید کے دور میں مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ، مسجد نبوی اور بیت اللہ کی وہ بے حرمتی کی گئی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ مسلمان عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو شدید اور قابل نفرین مظالم کا شکار بنایا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو وقتی مصلحت کے تحت مسلمانوں کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے اور سول انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر سرفراز تھے (تاریخ شام ص ۴۲۵ تا ۴۳۹) فلپ حتی تاریخ اعراب ص ۱۹۵ پر لکھتا ہے۔ میسون کو صحرا سے محبت تھی۔ اسے حضرت معاویہ یا ان کے دربار دمشق سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ صحرا کی بیٹی تھی صحرا سے محبت اس کی گھٹی میں پڑی تھی اس لیے وہ بار بار اپنے میکے جایا کرتی تھی اور اپنے بیٹے یزید کو اپنے ہمراہ لے جایا کرتی تھی۔ فلپ حتی نے میسون کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن وہ ایک غزل گا رہی تھی (وہ غزل اس کی اپنی نہ تھی بلکہ پرانے زمانے کی مشہور تھی اور کسی نامعلوم شاعر کی لکھی ہوئی تھی) جس کے ایک شعر کا مطلب یہ ہے "اے کاش! ایک سوتے ٹیڑھے کی بجائے میرے چچا کا دراز قامت بیٹا ہوتا جس سے میں منسوب ہوتی۔" حضرت معاویہ نے یہ شعر سن لیا اور میسون کو اپنے گھر سے نکال دیا اور وہ اپنے میکے چلی گئی (انسائیکلوپیڈیا اسلام جلد سوم ص ۱۵۶) ان تفاصیل کے لیے محمد یوسف کا مقالہ یزیدی المیوں کا پس منظر، تبصر، اکتوبر ۱۹۷۳ء رسالہ اسلامی تعلیم ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جلد ۲ شمارہ ۵۔ آل پاکستان اسلامک

ایجوکیشن کانگرس لاہور ایڈیٹر ڈاکٹر چودھری مظفر حسین مشیر رسالہ ڈاکٹر سید عبداللہ)

بہر کیف وہ پیش گوئی پوری ہوئی جو قیصر مورق بن ہرقل نے حضرت امیر معاویہؓ کو بتائی تھی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر کے حضرت امیر معاویہ کو حکمران بنایا جائے گا۔ بازنطینی عیسائیوں اور یہودیوں کی ریشہ دوانیاں کامیاب ہوئیں۔ حضرت امیر معاویہ نے ہرقلیت اور قیصریت کو خلافت کی جگہ قائم کر کے مسلمانوں میں شہنشاہیت یا ملوکیت کی بنیاد رکھی جس کو علامہ محمد اقبال نے اپنے چوتھے خطبہ میں خلافت سے امیر معاویہ کی بغاوت سے تعبیر کیا۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں۔ ''دمشق کے موقع شناس اموی فرماں رواؤں کو بھی جو عملاً مادہ پرستی کر چکے تھے، کسی ایسے عذر کی ضرورت تھی جس سے وہ کربلا کے مظالم پر پردہ ڈال دیں تاکہ اس طرح عوام کو موقع نہ ملے کہ ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور انہیں امیر معاویہ کی بغاوت کے ثمرات سے محروم کر دیں۔'' (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۷۰)

اس کی مزید وضاحت مرتضیٰ احمد میکش نے اپنی کتاب تاریخ اسلام حصہ دوم ص ۳۵۴ پر حضرت امیر معاویہؓ کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں۔ ''حضرت معاویہؓ رسول اکرم ﷺ کے صحابی تھے، لیکن ان کی سیرت، ان کے کردار اور ان کے طرز حکومت و سیاست کو خلفائے اربعہ کے معیار پر جانچنا فضول ہے، کیونکہ ان میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسے حضرت صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے کردار کی خوبیوں سے کوئی دور کی بھی نسبت ہو۔ خلفائے راشدین کی زندگیاں اللہ کے راستے میں وقف ہو چکی تھیں ان کا جینا اور ان کا مرنا محض اللہ کے لیے تھا اور ان سب کے پیش نظر فقط رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر دین اسلام کی بے لوث خدمت کے سوا اور کچھ نہ تھا، لیکن امیر معاویہؓ کے ڈھنگ شروع ہی سے عام دنیاداروں جیسے بن گئے تھے۔ حکومتی اقتدار حاصل کرنا اور اُسے ترقی دینا اور اس کے استحکام کی کوشش کرتے رہنا ان کی زندگی کا نصب العین بن گیا تھا۔ خاندان بنو اُمیہ کا شاہانہ اقتدار قائم کرنے کے لیے انہوں نے جو کامیاب جدّوجہد کی اس کا حال اوپر کے اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے۔ امیر معاویہؓ نے اس

مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اقدامات کیے وہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی سے زیادہ ہیں کہ امیر معاویہؓ میں تدبر سیاست، سیاسی جوڑ توڑ، انتظامات ملکی اور حزب بندی کی وہ تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں جن کا ہونا نوع انسانی کے کامیاب سلطانوں اور سلطنت کرنے والے اعاظم رجال میں ضروری ہے۔ امیر معاویہؓ حاکم ہونے کے وقت ہی سے شاہانہ کروفر سے رہتے تھے۔ قیصرو کسریٰ کی درباری شانیں انہوں نے شروع ہی سے اختیار کر لی تھیں اور شام کی ولایت کو اپنی طاقت کا منبع و مرکز بنانے کے لیے انہوں نے جنوبی عرب کے قبائل کی زیادہ تعداد اس ملک میں آباد کی جو ان کی بیوی کے رشتہ دار ہونے کے باعث ان کی ذات سے اُنس رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے امور سلطنت میں شام کے عیسائیوں کی امداد لے کر انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ سرجون ابن منصور عیسائی امیر معاویہؓ کا مالی مشیر تھا"..... شام میں آباد ہونے والے مسلمان عربوں میں سے صرف امیر معاویہؓ کی بیوی اور یزید کی ماں کے متعلق روایت ہے کہ وہ دمشق کے عالی شان محلوں کی زندگی کو ناپسند کرتی تھی۔ یہ عورت صحرائی دختر تھی اور صحرا کی کھلی فضاؤں کو یاد کر کے اداس ہو جاتی تھی۔ اس کا ایک گیت اس کے دلی احساسات کی ترجمانی کر رہا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے:

"وہ خیمہ جسے صحرا کی ہوائیں جھولا جھلاتی ہیں مجھے شاندار محلوں سے زیادہ عزیز ہے۔ مَیں ساز و یراق سے آراستہ گھوڑے کی بہ نسبت جوان اونٹ کی سواری کو زیادہ پسند کرتی ہوں۔ ریگ کے میدانوں میں بادِ صرصر کا گیت مجھے شہروں کی قمناؤں سے زیادہ شیریں لگتا ہے۔ صحرائی خیمہ میں بیٹھ کر سوکھی روٹی کھانا مجھے محلات کی نفیس ترین غذاؤں اور شرابوں سے زیادہ مرغوب ہے۔ میرے قبیلے کا شریف عرب مجھے ان ڈاڑھیوں والے ملمع کار لوگوں سے جو میرے اردگرد جمع ہیں، زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کاش مَیں پھر اپنے صحرائی گھر میں پہنچ جاؤں اور پھر کبھی ان شان دار ایوانوں کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھوں۔" (تاریخ اسلام حصہ دوم ص ۳۵۴، ۳۵۵)

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے جذبہ جہاد سے سرشار مجاہدین سرحدوں پر جہاد کر کے ملک کے ملک فتح کرتے جا رہے تھے اور مال غنیمت دارالسلطنت کو بھیجوا رہے تھے اور اموی اور عباسی حکمران ان سے عالی شان محلات میں گلچھرے اڑا رہے تھے ایک اموی حکمران نے تو یہاں تک تاسف کا اظہار کیا کہ لوگ تیزی سے مسلمان ہو رہے ہیں اور اس سے جزیہ کی وصولی کم ہوتی جا رہی ہے۔ خود موسیٰ بن نصیر کے بعد اس کے بیٹے عزیز کی عیسائی بیوی نے اپنے زیورات توڑوا کر عزیز کے لیے سونے کا تاج بنوایا جسے وہ صرف گھر میں پہنتا کہ سونا پہننا غیر شرعی ہے اس کے ایک جرنیل کی عیسائی بیوی نے اسے دیکھ لیا تو اس نے اپنے خاوند سے بھی سونے کے تاج کی ضد کی۔ یہ بات فوج میں پھیل گئی اور بغاوت کے نتیجے میں عزیز بن موسیٰ نصیر کو قتل ہونا پڑا۔

حضرت امیر معاویہ کے حرم میں بنی کلب کی بیس سالہ عیسائی دوشیزہ میسون داخل ہو گئی جو امیر معاویہ سے نفرت کرتی تھی مگر ان کے بیٹے یزید کی ماں تھی۔ اس کے ذریعے ہی امیر معاویہ کی فوج اور دربار میں عیسائی بارسوخ ہو گئے اور عملاً اقتدار ان کے قبضہ میں آ گیا اور بنی کلب کی اس عیسائی دختر میسون کے بیٹے یزید نے جس کی تربیت شام کے صحراؤں میں خیمہ زن عیسائیوں نے کی تھی نواسہ رسول ﷺ حضرت امام حسینؓ کو خاندان سمیت خون میں نہلا دیا۔ پھر اموی اور عباسی ملوکیتیں فتوحات بھی کرتی رہیں علم کی سرپرستی بھی کرتی رہیں اور ملوکیت کے مسلمانوں کی گردنوں پر پنجے بھی گہرے طور پر گاڑھتی رہیں اور اس کی کوکھ سے سلطنتِ عثمانیہ پیدا ہوئی جس نے ملتِ اسلامیہ کو تاش کے پتوں کی طرح بکھیر کر رکھ دیا اور اس وقت سے لے کر ہم اس فصل کو بو اور کاٹ رہے ہیں۔ یہ کتاب جس کا موضوع مسلمانوں کے تنزل کے اسباب اور ترکی کی خلافت عثمانیہ ہے اس گہرائی میں نہیں گئی۔ مولانا سلیمان اشرف کا اندازِ تحریر گہری تنقیدی بصیرت کے برعکس دردمند جذبوں سے مرصع ہے۔ اور ان کا یہ تجزیہ درست ہے کہ اسلامی سیاست قوانین الٰہی کی محکوم ہے۔ اور جب کوئی قوم عمل سے محروم ہوتی ہے تو اسے قدرت کا بے رحم ہاتھ تاریخ کے عجائب گھر میں نشانِ عبرت بنا کر سجا دیتا ہے اور یہی مسلمانوں کے زوال کا المیہ ہے۔ (اس سلسلے میں کیرن آرم

اسٹرانگ کی کتاب تاریخ اسلام بھی دیکھیں) جو اموی ملوکیت کی خاکستر میں خرابی کی صورت شروع سے ہی مضمر چلا آ رہا تھا۔ اور جسے امیر معاویہؓ کی فتوحات روک نہ سکیں صرف وقتی زوال کو بڑھا دیا جو عباسی خلفا کا مقدر رہا کہ عباسی خلیفہ کو قالین میں لپیٹ کر ہلاکو خان کے دربار میں اس کے برمکی وزیر کے سامنے جلا کر راکھ کر دیا گیا اور تاتاریوں نے ہماری ملوکیت کی اینٹ سے اینٹ ایسی بجائی کہ ہم آج تک اپنے زخموں کا لہو چاٹ رہے ہیں۔ عرب ممالک پر اب بھی ملوکیت امریکی اور مغربی سرپرستی میں قائم ہے ترکی پر سیکولر فوج کی آمریت ہے۔ مصر، لیبیا اور دوسرے ممالک کے ساتھ ساتھ خود آئینی اور دستوری جدوجہد سے بننے والے پاکستان میں فوج کی حکومت رہی ہے وہ جب چاہتی ہے، منتخب حکومتوں کو آئین اور پارلیمنٹ سمیت اُلٹ دیتی ہے۔ امریکی اور مغربی مفادات ان کی رگ رگ میں بھرے ہیں اور پاکستان کے عوام بھوک، جہالت، بیماریوں اور محرومیوں کی دلدل میں پھنسے اپنا لہو پیتے اور چاٹتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تاریخ پر پردے ڈالنے کی بجائے چیر پھاڑ کر حقائق سامنے لانے چاہئیں تاکہ ہم اپنے بے رحم ماضی کو بھسم کر کے اپنے لیے تابندہ کو آگ اور روشنی پیدا کر سکیں اور عرب ملوکیت سے آزاد اسلامی جمہوری اور فلاحی ریاست کا پاکستان کو نمونہ بنا سکیں، جس کی دوسرے اسلامی ممالک پیروی کریں۔

مولانا سید سلیمان اشرف سلطنتِ تُرکیہ کے بانی محمد عثمان خان کے ذکر سے آغاز کرتے ہیں کہ اس کے عہد میں ابتری تھی۔ ایران اور بغداد ادبار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تاتار اور عیسائی مسلمانوں سے دست و گریباں رہتے تھے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ چنگیز خان ہلاکو خان اور دوسرے تاتاریوں کی عیسائی بیویوں نے کس طرح انہیں بھڑکا کر عالمِ اسلام کی ان جلادوں کے ہاتھوں اینٹ سے اینٹ بجوادی۔ محمد عثمان کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ اپنی قوت کو مجتمع کرتا رہا تاکہ دشمنوں کا مقابلہ کر سکے۔ سید سلیمان اشرف نے امیر تیمور کی بایزید یلدرم سے لڑائی اور سلطان بایزید کی شکست کا حال تو بیان کیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ بایزید یلدرم کی عیسائی

یوی نے اسے شراب پلا پلا کر کھوکھلا کر دیا تھا پتا نہیں قسمت کو ہی اس کا منظور ہونا چاہیے تھی۔ کاش وہ یہ بھی بتاتے کہ جب عثمانی یورپ پر اور وی آنا آسٹریا پر حملے کر رہے تو شاہ اسمٰعیل صفوی کے بعد شاہ عباس صفوی کے دربار میں سر رابرٹ شرلے اور اس کا بھائی صفویوں کو تو یہی بتا کر دے رہا تھا نا کہ وہ پیچھے سے ترکوں پر حملہ کریں اور ترکوں کے قدم روکا کر وہاں آ جائیں اور یورپ کی فتح ترکوں کا خواب ہی رہے۔ تاریخ کا گہرا تجزیہ یہاں درکار تھا مگر شاید سید سلیمان اشرف کے فاضل نظر اس قدر گہرائی نہ تھی صرف برعظیم کے مسلمانوں کو بیدار کرنا تھا اور وہ اپنا مدعا جوش خطابت کی زبان میں احسن طور پر ادا کرتے رہے۔ تاہم سید سلیمان اشرف نے سلطنت ترکی کے خلاف عیسائیوں کی ریشہ دوانیوں کو بیان بھی کیا ہے کہ قسطنطین اکبر نے اعثمانوں کو فتح کر کے اپنا نام قسطنطین رکھا۔ اور امیر معاویہ نے پہلی ہی صدی میں ایک لشکر بھی روانہ کیا مگر وہ ناکام ہو کر واپس آ گیا۔ اس لشکر میں یزید شامل تھا، جس کو اہل لوگوں نے امیر لشکر بھی کیا ہے اور فاتح قسطنطنیہ بھی کیا ہے جو افسانہ طرازی کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ قسطنطنیہ ۵۳ ہجری میں ابو ایوب خالد بن زید انصاری نے فتح کیا تھا یزید نے نہیں۔ حضرت ابو ایوب انصاری میزبان رسول کا سر سے میں شہید ہوئے اور قلعے کی فصیل کے باہر مدفون ہوئے۔

مولانا سید سلیمان اشرف کی یہ تصنیف نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے زریں دور سے ہمیں آگاہ کرتی ہے اس کے عروج و زوال کی داستان بھی سناتی ہے اور اسلام اور خلافت کے باب میں اسلام کا تصور خلافت بھی بیان کرتی ہے جس کی بنا پر اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا نے سیٹ کر اپنی سیکولر فوج کو ترکی پر مسلط کر دیا تھا جس نے عربی اذان اور نماز پر پابندی لگا دی اور ترکی زبان میں اذان ہونے لگی جب ترکی میں عظیم مصلح نورسی سعید کے حامیوں کو جمہوری اقتدار ملا اور صدر جلال بایار اور وزیر اعظم عدنان مندریس برسر اقتدار آئے، تو انہوں نے یہ پابندیاں ختم کر دیں جس پر ترکی کی سیکولر فوج نے ان کا تختہ الٹ کر قبضہ کر لیا۔ جو جلاب کی وجہ سے جلال بایار کو قید اور جناب عدنان مندریس کو شہید کر دیا۔ اتاترک کے اقتدار کے نتیجے میں اگرچہ ان نے خلافت عثمانیہ کی

عرب بھائیوں کا راگ الاپ کر مصر کو فرعونوں کے حامیوں میں اور عرب کی پارٹ کر کے غدار شریف حسین مکہ کے خاندان میں بانٹ دیا۔ سعودی عرب میں اسے اردن میں شاہ حسین، عراق کو فیصل کے حوالے کر دیا جہاں ان کے یہی ماموں کی ملوکیتیں اب بھی قائم ہیں۔ لبنان میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی مخلوط حکومت قائم کی، شام میں الگ حکومت قائم کی اور اسرائیل کی تخلیق کی اور اپنا محور اپنی اعانت سے فلسطین کے قلب میں یہودی ریاست قائم کی۔

غالباً علامہ اقبال نے یہ قول سید سلیمان اشرف سے ہی لیا ہوگا کہ طاقت کے بغیر دین محض ایک فکر یہ فلسفہ ہے۔ اسلام اور خلافت میں سید سلیمان اشرف لکھتے ہیں۔ "جو مذہب اپنی حفاظت نہیں کر سکتا اور اپنی ماموں زندگی کے لیے طاقت و قوت نہیں رکھتا ہے اس کا وجود محالات عادیہ میں سے ہے اور وہ ایک فلسفہ خیالی سے زائد مرتبہ نہیں رکھتا۔" (ص ۲)

حضرت علامہ محمد اقبال نے یہ جو فرمایا ہے کہ

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی!

ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی!

ایک اور مقالات سید سلیمان اشرف کے بھی ہیں لکھتے ہیں۔ "اسلام کے محفوظ و مامون رہنے کا ایک بڑا اصل یہ قرار دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز ہونا چاہیے اور اس مرکز کا کوئی محافظ۔ چنانچہ مکہ معظمہ یعنی بیت اللہ اور مدینہ طیبہ یعنی حرم رسول اللہ تمام دنیائے اسلامیہ کے مراکز قرار دیے گئے۔ اور ان بابرکات آنحضرت ﷺ کے مکانوں، دونوں شہروں کے محافظ۔" (ص ۳) علامہ اقبال کے افکار سید سلیمان اشرف سے کتنے ہم آہنگ ہیں اس میں کوئی کلام نہیں۔ علامہ بھی مسلمانوں کو نوے حرم لے جانے کا داعیہ رکھتے ہیں اور حضرت محمد ﷺ سے وفا کو لوح و قلم کا مالک گردانتے ہیں۔ یہ کتاب ایسے ہی پر حکمت اور بلیغ افکار سے بھری ہوئی ہے۔ اس کتاب کی ضرورت اُن کے اپنے دور میں بھی تھی اور آج بھی یہ کتاب اس طرح ہماری ضرورت ہے کہ مسلمانوں پر اب بھی یہ حالت جان کنی کی طاری ہے یہود و ہنود اور عیسائی مسلمانوں کے خلاف یک جان ہو گئے ہیں۔ مولانا سلیمان اشرف چونکہ دینیات کے

استاد تھے لہٰذا کتاب کا انداز اور مزاج بھی ویسا ہی ہے ہمارے عام طبقے سے زیادہ علما کو اس کتاب کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ آج کے مسائل کا حل اخذ کر سکیں کہ ماضی سے روشنی لے کر ہی ہم مستقبل کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا تھا کہ ملک ہاتھوں سے جاتا ہے تو جائے۔ مسلمان کو احکام حق سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے اور مسلمانوں کی ہر کڑے وقت میں مدد اسلام نے ہی کی ہے۔ یہی شیخ سلیمان اشرف کا پیغام ہے فرماتے ہیں۔

"عزیزو ہوشیار ہو شیار۔ دین کی دولت ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ اس شاہانہ زندگی سے جو کفر کے ساتھ بسر آتی ہے ہزار درجہ وہ عسرت کی زندگی محبوب ہے جس میں چاشنی ایمان کی اور سوز عشق الٰہی کی ہو۔"

یہی ان کا پیغام ہے اور اسی پر اپنا اختتام پذیر ہوتا ہے کہ یہی ہماری بقا کا ضامن ہے۔

ڈاکٹر وحید عشرت

ایم اے (فلسفہ) پی ایچ ڈی (فلسفہ)

سابق ڈین آف آرٹس اقبال اکادمی پاکستان

اور سابق ڈین فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ لٹریچر پروفیسر فلاسفی پنجاب یونیورسٹی لاہور

وصال بیکنر ریسرچ آفیسر و مدیر اردو معارف اقبال

شعبہ اقبالیات اور بنگلہ کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور

۱۹ دسمبر ۲۰۰۸ء

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا

اَلْبَلَاغ

مسلمانوں کے تنزل کے اسباب اور خلافت عثمانیہ کے تاریخی واقعات اور اُسکے ساتھ
مسلمانوں کے تعلقات پر تفصیلی بحث اور آیندہ کے لئے مفید ہدایتیں

مولف

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب بہاری

باہتمام حواری حضرت اقدس مولانا صاحب مدظلہ العالی

مطبع اتمی علی گڑھ میں طبع ہوا

بار اول مرتبہ ماہ مئی ۱۹۱۱ء تعداد ۱۰۰۰ قیمت بہ محصول ڈاک چھ آنہ

البلاغ

مؤلفہ

مولنا سید سلیمان اشرف صاحب

فہرست مضامین

(۱) مسلمانوں کا قومی انحطاط

(۲) اسلام اور خلافت

(۱) اسلام و تمدن۔

(۲) اسلام و سیاست

(۳) اسلام و عرب۔

(۴) خلافت۔

(۵) خلافت بنو امیہ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً

ہر موجب عقل زنہ گانی کردن — باید کردن دلے نہ انی کردن
استاد تو روزگار چابکدست ہست — چنداں بہر ست انکہ دانی کردن

کارخانہ عالم ایک تعلیم گاہ ہے۔ اور حوادث یومیہ کلاس۔ قانون قدرت کا زبردست درس ہمیں دیا گیا ہے جس نے صحیفہ ہستی کا مطالعہ کیا اور سمجھا وہ کامیاب ہوا۔ اور جس نے اس سے کچھ بھی چشم پوشی کی اُس نے ناکامی کی ایسی ٹھوکر کھائی کہ قعر پستی میں گر کر پھر نہ سنبھلا۔

یہ جابر زبردست درس کبھی اس کا خیال نہیں کرتا کہ گرا کون اور سنبھلا کون اس کا درس ہمیشہ اسی سرگرمی سے جاری رہتا ہے۔ اور فاضل سشت کابل۔ تبیش پیشہ اور عاقبت نالہ ریش جماعت فنا ہوتی جاتی ہے۔ اور عاقل بابصیرت۔ بھنی تال میں بلبتہ وجود میں آکر بقا کا لطف اٹھاتا ہے۔ یہ ایک ایسا بدیہی مسئلہ ہے جس کی برہان کی حاجت تو دلیل کی ضرورت۔ مشاہدات یومیہ اس پر شاہد عدل ہیں۔

آؤ اب تھوڑی دیر کے لیے اس درس گاہ میں ہم جماعت اسلامیہ کو دیکھیں کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ آیا اُس استاد کے سبق سے بیداری اختیار کرتی ہے یا ایک خوشگوار خسارہ سمجھ کر اپنی عمر کا ذریعہ جانتی ہے۔ آہ! افسوس ایماں تو عجیب

وشت ناک سماں ہے۔ دیکھو دیکھو مشرق سے تا مغرب تمام جماعت اسلامیہ بیطرح پانوں پھیلائے بیخبر سو رہی ہے کہ موت کی صدا بھی انھیں بیدار نہیں کرتی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرتے جاتے ہیں مگر انھیں خبر نہیں۔ فنا ہوتے جاتے ہیں مگر آگاہی نہیں نیست کے جارہے ہیں مگر احساس و شعور تک نہیں حیرت ہوگی کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ تو اپنے استاد کے بڑے محبوب تلامذہ تھے، آج ان پر چشم عنایت کیوں ہے؟ ان کا وجود تو تخلیق عالم کا تخمینہ و حاصل تھا! آگہی دیگر اقوام کے لئے ہر آن وشنود تھی! ان سے مدرسۂ عالم کی زینت اور دنیا کی رونق تھی! پھر یہ کیوں ہو گئے جارہے ہیں؟ ان کا نام کیوں محو ہو رہا ہے؟

اس کا سچا جواب یہ پاؤ گے کہ ایک مدت سے یہ سبق سیکھنا اور استاد کی باتوں پر کان لگانا انھوں نے چھوڑ دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا جو ہوا ہے اب اس پر دیکھنا ہے کہ دنیا سے ان کی بدنصیبی کب ختم ہوگی ہے۔ مگر ایک لمبی طویل داستان ہے جس کے لئے بہت وقت اور فاتر درکار ہوں گے لیکن سلسلہ کے لئے مختصر یہ ایک نشان کافی ہے کہ جب سے مسلمانوں میں خودی پیدا ہوئی اور غلامانہ رنگ آیا، تقوے، جو تمام محاسن اخلاق کی روح ہے، گم ہو گیا۔ انھی وقت سے بے توجہی بھی ہوگئی۔ ادھر زمانے نے سبق بدلا اُدھر انھوں نے گویا، ادھر استاد نے آہستہ آہستہ انھیں مراتب عالیہ سے گرانا شروع کر دیا۔ مگر ایک مدت تک ان کی پستی بھی دوسروں کی بلندی سے بلند ہی رہی، مگر کب تک؟ اسی حالت میں بنو امیہ اور خلفائے عباسیہ کا دور ختم ہو جاتا ہے اور آل عثمان کا زمانہ آتا ہے۔

محمد عثمان[1] خاں جو خاندان ترکیہ کا پہلا فرمانروا ہے، جس وقت بادشاہ ہوا ہے، تو تمام ممالک اسلامیہ کا شیرازہ جب ابتری کے ساتھ درہم برہم تھا

---

[1] بانی دولت عثمانیہ۔ محمد عثمان بن سردار ارطغرل۔ تخت نشینی ۱۲ محرم ۶۹۹ھ / ۱۶ ستمبر ۱۲۹۹ء جنھوں نے مغربی جماعت اور ایشیائے عیسائی قوانوں کو مغلوب کر کے اور سلجوقی امرا کو اپنے ساتھ ملا کر ایک اسلامی سلطنت بنائی۔

ہاتھ میں ہے۔

مگر جب سیاست سے ملت کا اثر کم ہو گیا تو یہ تین اہم اصول جو نہ صرف بقائے وجود کے لئے بہم سکھلائے تھے ہمارے ہاتھوں سے ایسے کھوئے گئے کہ پھر نہ ملے۔ چنانچہ یہ مہم اتفاق و اتحاد کا مسئلہ جب ہماری نگاہوں میں سبک ہو گیا تو اس کا ادائے انتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوت جو ایک جگہ جمع تھی تین حصوں میں منقسم ہو گئی بنی فاطمہ مصر کے فرمانروا ہوئے۔ بنو امیہ اندلس میں حکومت کرنے لگے بنو عباس بغداد میں خلیفہ مانے گئے۔ اس انقسام کا نتیجہ چند ہی روز میں ظاہر ہو گیا۔ بغداد کی خلافت تاتاریوں کے حملہ سے تباہ ہوئی۔ بنی فاطمہ کی حکومت پر چرچ اکثر قابض ہو گئے اور بنو امیہ سے صلیبی پرستوں نے اندلس خالی کرا لیا۔ مگر اب بھی مسلمانوں کو مذہب کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔

اب ترکی حکومت کے آغاز پر نظر ڈالو۔ اس زمانہ میں جبکہ عثمان خاں اپنی متفرق طاقت کو مجتمع کر رہا ہے تاکہ دشمنوں کا مقابلہ کرے۔ تم دیکھو گے کہ بجائے اسکے کہ منتشر طاقتیں سمٹکر ایک ہوں۔ ایک دوسرے کو فنا کرنے کے درپے ہے۔

باوجود اس کے کہ تمام دنیائے اسلام دیکھ رہی تھی کہ اسوقت اسلام کو دو قومیں سخت زندگی کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں۔ ایک تاتار۔ دوسرے عیسائی اور جب کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک کو کچھ بھی موقع مل جاتا ہے تو فوراً اسلمانوں سے دست و گریبان ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی ایک اسلامی حکومت دوسری اسلامی حکومت کو استوار ہونے کی مہلت دینا اپنے لئے موجب عار سمجھتی ہے آل عثمان اور اہل ایران میں جو کشت و خون متعدد مقامات پر مختلف اوقات میں ہوئے اور جس قدر جانیں تلف ہوئیں۔ شاید اتنے مسلمان تاتاریوں اور

لہ خلافت فاطمیہ مصر ۲۹۷ھ تا ۵۶۷ھ مطابق ۹۰۹ء تا ۱۱۷۱ء اندلس کی اموی امارت و خلافت ۱۳۸ھ تا ۴۳۲ھ / ۷۵۶ء سے ۱۰۴۱ء تک بنو عباس کی دینی مسند خلافت ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء تا ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء تا ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء

کے انقسام یعنی بٹ جانا حصہ حصہ ہونا منقسم ہونا۔ تاتاری ابتداءً منگولستان یا منگولیا کے

عیسائیوں کے ہاتھوں سے بھی نہ شہید ہوئے ہونگے رہے

اس قسم کے باہمی مقاتلوں کو قیاس کرنے کے لئے صرف ایک واقعہ بیان کردینا کافی ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہوجاوے کہ توتوں کا استقال کس بُری طرح ہوتا تھا۔

بایزید یلدرم، جو عثمانیوں کا چوتھا بادشاہ ہے، اُس سے اور امیر تیمور گورگان صاحبقراں سے ایک ادنیٰ بات پر ان بن ہوگئی۔ تیمور ایک لشکر جرار لیکر سلطان بایزید پر چڑھائی کرتا ہے۔ اُدھر سے سلطان بایزید اپنی پوری طاقت سے حملہ کا جواب دینے کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ دونو سلطنتوں میں معرکہ کارزار گرم ہوا، خون کے دریا بہ گئے اور بڑے بڑے شجاع وبہادر جانبین سے داد شجاعت دیکر عالم بقا کو چل بسے۔ آخر سلطان کو شکست ہوئی اور امیر کے سپاہیوں نے بایزید کو گرفتار کرلیا۔ سلطان اس صدمہ روح فرسا کو برداشت نہ کرسکا اور شدت رنج کے باعث تپ محرقہ میں مبتلا ہوکر چند ہی دنوں میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ امیر نے بھی اپنی فتحمندی پر نازاں اپنے ملک کیطرف مراجعت کی۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنا قدم یورپ میں جمالیا ہے اور عیسائیوں سے جنگ برابر جاری ہے۔ نصرانی سلطنتیں، باوجود باہمی عداوت کے مسلمانوں کے مقابلہ کو دیکھ پر قسمیں کھائے بیٹھی ہیں۔ قیصر روم جو تمام شاہان نصرانی کا سرتاج ہے، مسلمانوں سے کئی بار مغلوب ہوچکا ہے مگر اپنی زہر آلود نگاہیں اُن مسلمانوں پر ڈال رہا ہے جنھوں نے یورپ کے ایک حصہ پر صلیب کی جگہ توحید کا علم نصب کر رکھا ہے۔ اس وقت عثمانیوں کا پایہ تخت بروسہ تھا۔

ان تمام ہمدردوں میں تم مسلمانوں کے باہمی جدال وقتال کا پر حسرت نظارہ دیکھوگے اور لاتحسبن اللہ غافلا عما یعمل الظالمون (اللہ ظالموں کے کاموں سے غافل نہ سمجھو) کا ایک ادنیٰ مفہوم سمجھ لوگے۔ پھر تم کو معلوم ہوجائیگا کہ اللہ کے بندو! تمھارے ہی بھائی بند تھے جنھوں نے اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ اور اسی لئے اللہ نے تمھیں اُن کی جگہ دی ہے۔ اب تم اُن کی طرح نہ کرو۔ اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور آپس میں متفرق نہ ہو۔ اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو تم پر ہے کہ تم آپس میں دشمن تھے اللہ نے تمھارے دلوں میں الفت دی تو تم اللہ کے فضل سے بھائی بھائی ہوگئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے اللہ نے تم کو اُس سے بچالیا۔ اللہ اپنی آیتیں تمھارے لئے بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے اچھے کام کا حکم دے اور برے کام سے روکے۔ یہی لوگ فلاح پانیوالے ہیں۔ اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہوگئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگے بعد اس کے کہ اُن کے پاس روشن دلیلیں آچکی تھیں۔ اور یہی لوگ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے۔ (آل عمران رکوع ۱۰)

۱؎ ترکوں کا ایران سے جنگ کا پہلا زمانہ ۱۵۷۷ء سے ۱۵۹۰ء تک ہے، اس وقت ترکی کے سلطان مراد خان ثالث (۱۵۷۴ء-۱۵۹۵ء) اور ایران پر شاہ عباس صفوی اول (م ۱۵۷۶ء-۱۶۲۸ء) کی حکومت تھی۔ تاریخ ملت میں یکجہتی کرانیوالوں کی دراز دستی کی بدولت ان کے ساتھ جنگ

کا اثر زائل ہوتے ہوتے پاؤ گے۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھو گے کہ ابتک اُنھیں یہ ضرور یاد ہے کہ لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰى أَوْلِيَاءَ[1] اسی وجہ سے ابھی تک اُن قوموں کے دام محبت میں، جسکے ہر تار و پود فریب و تدلیس کے ہیں، گرفتار نہیں ہوئے ہیں۔ جس کے باعث فتوحات کا سلسلہ برابر مختلف اطراف عالم میں جاری ہے۔ ایک مسلمان بادشاہ ہندوستان میں بتوں کو سرنگوں کرتا ہوا توحید کا جھنڈا اڑاتا ہوا داخل ہوتا ہے، تو دوسرا قسطنطنیہ میں نعرہ اللہ اکبر بلند کرتا ہوا گرجاؤں اور کنیسوں[2] کو تثلیث کے تسلط سے پاک وصاف کرتا ہے۔ اللہ اللہ وہ بھی کیا زمانہ تھا ؎

یاد ایامیکہ در کویت مکانے داشتم + ہمچو بلبل در چمن ہم آشیانے داشتم

قسطنطنیہ ایک قدیم شہر ہے، جسکی بنا شاہ بیزنس نے جو حضرت عیسےٰ علیہ السلام سے بارہ سو برس پیشتر تھا، ڈالی تھی۔ اور اس کا نام اپنے نام پر بیزنسیہ رکھا تھا۔ جب عیسائیوں کا غلبہ ہوا اور قسطنطین اکبر نے ۳۳۰ء میں اس شہر کو فتح کیا تو پہلے نام کو بدلکر اس کا نام قسطنطنیہ رکھا۔ یہ شہر خلیج بحر اسود پر واقع ہے شمال کی طرف یکے بعد دیگرے تین فصیلیں ہیں باقی تین جوانب سے دریا محیط ہے، اس لئے یہ جگہ قدرتی طور پر بہت ہی محفوظ ہے۔ تھوڑی تیاری و ہوشیاری بھی ایک لشکر جرار کا منہ پھیر دینے کے لئے کافی خیال کیجاتی ہے۔

اسی لئے مسلمانوں کی نگاہ نے اس کی جانب پہلی ہی صدی میں توجہ کی چنانچہ حضرت امیر معاویہ نے ایک لشکر اسکی طرف اپنے زمانہ حکومت میں روانہ فرمایا۔ جنگ کچھ دنوں تک جاری رہی لیکن سردی کی شدت نے بغیر فتح کے لشکر اسلامی کو مراجعت پر مجبور کیا۔ چونکہ اُس وقت فتوحات کا دروازہ مسلمانوں پر کھلا ہوا تھا، اسلئے یہاں سے پلٹ کر دوسری طرف

[1] (اے ایمان والو!) یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ (سورۃ مائدہ: ۵۱)

[2] کنیس، کنیسہ کی جمع۔ کلیسا، گرجا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا عبادت خانہ

متوجہ ہوگئے اور قسطنطنیہ کی فتح کو کسی اور موقع کیلئے اٹھا رکھا۔

مگر اس لڑائی کا ایک واقعہ قابل الذکر ہے۔ جس سے قرن اولیٰ کے مسلمانوں کی سطوت و رعب کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ لشکر جو امیر شام نے قسطنطنیہ روانہ کیا تھا اُس میں حضرت ایوب انصاری (رضی اللہ عنہ بحرمتہ) جو نبی کریم (علیہ الوف الصلواۃ والتسلیم) کے بڑے برگزیدہ صحابی تھے اور جنھیں یہ فخر حاصل تھا کہ پہلے پہل مدینہ طیبہ میں جب آقائے دو عالم کے مبارک قدم ہجرت فرما کر تشریف لائے۔ تو آپ ہی کے مکان پر اقامت فرمائی اور مہمان ہوئے۔ آج اس لڑائی میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ انصاری میزبان شہید ہوتا ہے[1]۔ اور مسلمان اس کا مزار مقدس قسطنطنیہ میں بنا کر بادِ غدغہ اپنے ملکوں میں واپس آتے ہیں۔

اس میں نصاریٰ یہ گفتگو کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی حماقت دیکھو اپنے ایک بزرگ کا مقدس مزار ہم عیسائیوں کے شہر میں جہاں بجز دشمن کے دوست کا نام بھی نہیں۔ کس بیباکی سے چھوڑے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے منہ موڑتے ہی ہم اس مُردے کی لاش کو قبر سے باہر نکال کر پھینکدینگے اور ہر طرح کی بے حرمتی جو دلمیں آئیگی کر گذریں گے۔

اتفاقاً یہ خبر مسلمانوں تک پہونچی۔ سپہ سالار اسلام نے عیسائیوں سے کہلا بھیجا کہ خبردار اس حماقت کا کبھی وہم بھی نہ کرنا۔ ورنہ یاد رکھو کہ تمام ملک شام و بیت المقدس میرے قبضہ میں ہے۔ تمہارے بزرگ و مقدس اسلاف کی قبریں میری حکومت میں ہیں ایک قبر کی تم بیحرمتی کروگے ہم تمہارے تمام بزرگوں کی قبروں کو اوکھیڑ کر تہ و بالا کر ڈالیں گے اِس جواب کے سنتے ہی عیسائیوں پر وہ رعب چھایا۔ کہ انھوں نے مسلمانوں کو پیام دیا کہ مہربانی فرما

[1] اور اُن کی میّت کو ان کی وصیّت کے مطابق قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے لے جا کر دفن کیا گیا۔ ان کا مزار جلد ہی عیسائیوں کی زیارت گاہ بن گیا جہاں وہ خشک سالی کے زمانے میں بارش کے لیے دُعا مانگا کرتے تھے۔ اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، ۲۱: ۲۹۳۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

بار دوم ۲۰۰۱ء بے دغدغہ بے لاگ بے خوف و خطر

آپ قبر کو خاص علامات سے محیط کرتے جایئے۔ ورنہ کہیں تم دگوں کو شبہ بھی ہوگیا۔ تو ہماری اسلاف کے مزاروں کی خیر نہیں۔ اس واقع کے آٹھ سو برس بعد تک عیسائی قابض رہے۔ مگر کسی کو جرأت ایک مشت خاک کے بھی بدل کرنے کی نہ ہوئی۔

عزیزو۔ ایک وہ زمانہ مسلمانوں کے جاہ وجلال ہیبت وعظمت کا تھا اور ایک یہ وقت اب آپہونچا۔ کہ اٹلی جیسی بزدل قوم مسلمانوں کو یہ دھمکی دے کہ طرابلس سے دست بردار ہوجاؤ۔ ورنہ خانۂ کعبہ اور روضۂ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر گولہ باری کرونگا۔ خاکش بدہن۔ یہ تو اُسکی جرأت و بیباکی۔ اور ہماری بے شرمی و بے حسی کی صدا کو۔ نغمہ دلفریب سمجھا غیرت اسلامی وحمیت ایمانی بس اسیقدر تھی کہ دو منٹ کیلئے۔ غافل قلب وآلودہ زبان سے دست بدعا ہوگئے، اور اسلام پر اپنے پندار میں بہت کچھ احسان وکرم کرلیا۔ آہ

ایک ہمارے اسلاف تھے جنھوں نے اسلام کی ایک ایک ادا پر اپنی بیشمار قیمتی جانیں قربان کرکے اُسکی عظمت وعزت کو قائم رکھا۔ اپنے خون سے سحاب رسول واہل بیت پیغمبر نے سینچ سینچ کر اس درخت کو ایسا سرسبز کیا کہ اُسکے پھولوں کی مہک اس کے پھلوں کا ذائقہ منکرین تک کے دماغ کو معطر کرتا کام وزبان کو حلاوت بخشتا اسی باعث جوق درجوق مشرک عیسائی یہودی اسلام میں داخل ہوتے جاتے تھے۔

اگلوں نے اسلام کی عزت کی اسلام نے اون کو عزت بخشی جب وہ اپنا کام کرچکے تو اللہ کی امانت پاک اسلام اپنے پھلوں کو سونپکے اور خود اسلام پر سے نثار ہوکر آیندہ آنے والی نسلوں کو ایک بلیغ سبق دیکر جہاں کیلئے پیدا کئے گئے تھے یہ کہتے ہوئے وہاں چل بسے۔

جان دی دی ہوئی اُسیکی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آج ہم گراون کی عزت و حمیت کا اپنے جوش و حیا سے مقابلہ کریں تو شاید اس قدر ہم بیحیا و بزدل ثابت ہونگے کہ بیحیائی و بزدلی کو بھی ہم سے ندامت آئیگی ۵ درسہ کس نہ رسد دعوئی توحید۔ منزل گہ مرداں موحد سردار تک[۱]

گذشتم از سر مال و آمدم بر سر فال

صاحبو۔ قسطنطنیہ[۲] پر جو حملہ کہ پہلی صدی میں کیا گیا تھا وہ اوس کی فتح کی تمہید تھی۔ اوس کے بعد برابر مسلمان حملہ کرتے رہے بالآخر ۸۵۷ھ ہجری میں سلطان ابو المعالی محمد خان ثانی اوس جگہ جہاں صدیوں تک صلیب و تثلیث کا پرچم لہرایا تھا توحید کا جھنڈا بلند کرتا ہے۔

لله الحمد ہر آن چیزکہ خاطر میخواست آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید[۳]

شہر فتح ہو جانے کے بعد سلطان[۴] محمد فاتح حکم نافذ فرماتا ہے کہ ایک مسجد عالیشان اوس جگہ طیار کیجائے۔ جس جگہ حضرۃ ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار مقدس ہے اور اس وقت سے قسطنطنیہ کا نام اسلام بول و استبول مشہور ہوا۔ جب مسجد طیار ہو گئی تو فاتح سلطان بروز جمعہ اوس مسجد میں جس کا نام مسجد ایوبیہ رکھا گیا تھا تشریف لائے شیخ الاسلام نے اپنے ہاتھ سے شمشیر سلطان کی کمر سے باندھ دی۔ اس دن سے یہ معمول آج تک چلا آرہا ہے کہ آل عثمان کا جب جدید بادشاہ تخت نشین ہوتا ہے تو مسجد ایوبیہ میں حاضر ہوتا ہے اور اس وقت کا شیخ الاسلام اس کے کمر سے تلوار باندھتا ہے۔ کاش یہ رسم بہت قرنوں تک قائم رہے۔

ظاہر ایسے اسباب ترقی کے معلوم ہو رہے ہیں اور قصہ اسلامی کی فتوحات جدیدہ سے مزین ہوتی جاتی ہیں۔ مگر نفس الامر میں بنیاد روز بروز کھوکھلی ہوتی جاتی ہے۔ اسلئے کہ عدم اتفاق و باہمی مقاتلے کے سبب ملک کو فراغ نصیب نہیں تھا۔

---

[۱] مجلس۔ نام دی کم ہمتی؛ بزدلی سے مدرسین کی کوہی توحید کا دعوای کرنا زیب نہیں دیتا۔ صاحب توحید لوگوں کی تو منزل ہی نیری ہو جاتی ہے۔ [۲] اب اس حال سے گزرتا اور قال (گفتگو) کی طرف آتا ہوں۔ [۳] قسطنطنیہ۔ رومی قیصر پرتاکا مرکز گیارہ سو سال سے زیادہ سیحی

[۴] محمد خان ثانی سلطان مراد ثانی کے بیٹے اور سلطان مراد کے بعد سلطان ہوئے ہیں

کبھی مصر میں بغاوت ہوتی ہے۔ کبھی بغداد میں۔ ایرانیوں سے کبھی لشکر جانبین مقصل ہوتے ہیں کبھی عربوں سے۔ اس پر ہر چہار سمت سے عیسائیوں کا نرغہ ایسی حالت میں جبکہ اطمینان مفقود سکون کوسوں دور ہو۔ ملک میں کیا ترقی ہو سکتی ہے۔ اقتشار و جنگ کے باعث نہ علوم سیکھے سکے نہ تجارت قائم کر سکے۔ اور حریف عیسائی علوم و تجارت سے آہستہ آہستہ اپنے کو مضبوط کرتے رہے۔ کبھی ان ایام میں مسلمانوں نے ایک دوسرے کو محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ایک دوسرے کے فنا کرنے پر تلا رہا۔ گویہ فیصلہ کرنا تو مشکل ہی ہے کہ زیادتی کس کی جانب سے ہوتی تھی اور شاید ہمیں اسکی چنداں ضرورت بھی نہیں کسی کی بھی ہو تھے تو سب مسلمان۔ ایک اسلامی سلطنت دوسرے اسلامی سلطنت پر کیوں نظر ڈالے۔ اور خاص کر اوس وقت جبکہ دشمن جان و ایمان کی زمینیں موجود ہوں اور وہ برسرپیکار بھی ہوں۔

محاسدہ اور منافرہ اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا کہ اوس زمانہ میں جبکہ سلطان محمد[1] سلیم خاں استنبول کا فرمانروا ہوتا ہے اور مصر کو ظالم چراکسہ کے ہاتھوں سے نجات دیکر خادم الحرمین الشریفین و خلیفۃ المسلمین کا لقب شوم سے پاتا ہے سلیم شاہ ہندوستان کا بادشاہ ہو کر اپنا لقب جہانگیر رکھتا ہے اور وجہ اس لقب کی یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں نہیں پسند کرتا کہ میرا ہمنام ہو اور سلطان کہلائے۔ غضب خدا کا مشارکت اسمی بھی گوارہ نہیں۔ جب دو دو بادشاہوں کے حسد کا یہ حال ہو تو قرب جوار کے روساء و سلاطین کے حسد کا کیا پوچھنا۔

لب اس سے بھی زائد تاسف و تحسر کا زمانہ سلطان[2] محمد سلیم خاں ثالث کا آتا ہے یہ بادشاہ ۱۲۲۳ھ ہجری میں آل عثمان کے تخت کا وارث ہوتا ہے۔ اور فوجی درستگی و دیگر معاملات ملکی کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوتا ہے۔ روسیوں سے کچھ لڑائی ہو کر صلح ہو جاتی ہے لیکن ایک اُفتاد یہ پیش آتی ہے کہ انھیں دنوں میں نپولین

[1] سلطان سلیم یا دوزیا سلیم اوّل ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں تخت نشین ہوا۔ ۱۵۱۷ء میں آخری عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ ثانی سے برضا و رغبت خود منصب خلافت کا دست بردار ہونے پر سلطان سلیم نے اس بارگراں کو اٹھا کر آل عثمان کی خلافت کا خطبہ جاری کر دیا۔ ۱۵۲۰ء/۹۲۶ھ میں وفات پائی تو ان کا بیٹا سلیمان قانونی سلطان

فرانس سے اوٹھتا ہے اور تمام بلاد یورپ کو بلاڈالتا ہے۔ خصوصاً انگلینڈ پر اس کی آتش فشاں نگاہیں عجب شعلۂ غضب ڈال رہی ہیں۔

اسے اتفاق کہئے یا تقدیری کہ سلطان محمد سلیم خاں ثالث اور نپولین میں رابطۂ اتحاد قائم ہوگیا۔

نپولین سلطان کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ فوج کی آراستگی جدید طریق پر کرنی چاہئے آلات حرب طرز قواعد و وضع لباس سب یوروپین انداز پر بنائے جائیں اور ہر ملک اپنے قدیم وضع پر نازاں ہے۔ اور اون ہی پہرانے اسلحہ پر مغرور اور دہر دنیا کا قدم ہر روز ایک ترقی کا وسیع میدان طے کر رہا ہے۔ اور نت نئے اوزار واسلحہ کی ایجاد سے پرانے ہتھیار بیکار و فضول بوجھ ثابت ہو رہے ہیں۔

سلطان کو نپولین کا مشورہ اسلئے پسند آیا۔ کہ اس نے اپنے ہر چہار سمت دشمنان دول یورپ کو جدید آلات حرب سے اپنے پرانے اسلحہ کو بیکار کرتے ہوئے دیکھا۔ فوج آمادہ و مستعد ہو کر بطرز جدید آراستگی فوج میں مصروف ہوا لیکن اسی جگہ یہ غلطی سلطان سے ضرور ہوئی کہ اصلاح تدریجی کو کام میں نہ لاکر یکبارگی لباس۔ طرز قواعد و اسلحہ سب متغیر کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ جسکے لئے ملک ہرگز آمادہ نہ تھا۔ سلطان محمد سلیم خاں ثالث سے پیشتر جو رخنے کہ ایوان اسلام میں پڑ گئے تھے وہ صرف باہمی نفاق و عداوت کے نتیجے تھے۔ اس نا اتفاقی اور ہر روز کی خانہ جنگی نے مسلمانوں کی کمریں شکستہ کر دیں تھیں۔ مگر اس تبدیل لباس کے اختلاف نے تو وہ زخم ہائے کاری سر پر پہونچائے کہ آج تک اوس کا چکر سر گرداں کر رہا ہے۔ کہیں خدا نخواستہ یہ زخمی تیور اکر گر پڑے۔

قوموں کی اصلاح جب کبھی کسی سچے و مخلص مصلح نے کی ہے تو ہمیشہ اہستگی کو مد نظر رکھا ہے۔ چنانچہ آفتاب اسلام نے جس وقت اپنی نورانی شعاعوں سے ظلمات

کفر و دہام پرستی کا استیصال شروع کیا ہے تو اصول تدریج و ہمہ گیری کا پورا پورا عمل ہمیں دکھلائی دیتا ہے۔

چنانچہ ارکان خمسہ آج بھی اسی تدریج و ہمہ گیری کا ہمیں سبق دے رہے ہیں۔ مثلاً ایک مشرک اگر دائرہ اسلام میں آنا چاہے تو پہلے اس پر کلمۂ شہادت فرض ہوتا ہے پھر نماز کا وقت آنے سے نماز اور ماہ صیام آنے سے صوم وغیرہ۔

حضرات جن کی نگاہیں مآل بیں نہیں ہوتیں۔ یا نفس الامر میں اصلاح مقصود نہیں ہوتا بلکہ اصلاح کے پردے میں افساد مدنظر ہوتا ہے وہ ہمیشہ شدۃ سے کام لیتے ہیں اور ایکبارگی انقلاب کل چاہتے ہیں اور اس زریں اصل کا لحاظ نہیں کرتے۔ اسوقت سلطان کی نگاہوں سے بھی یہی نکتہ نظر انداز ہوگیا۔

سلطان نے اٹھارہ ہزار فوج بطرز جدید طیار کی۔ دو ہزار تو خاص قسطنطنیہ میں تھی اور سولہ ہزار شہر قرمان میں زیر کمان قاضی پاشا۔ اور اس نئی فوج کا نام سلطان نے نظام رکھا۔ نپولین نے بعض ماہرین جنگ سلطان کی خدمت میں بھیجو تاکہ افواج سلطانی کی بطرز جدید تعلیم کریں اور اپنے اظہار محبت میں اس طرح کے چند کلمات لکھے کہ میں تمہارا دوست ہوں اور تمہارے دوست کا دوست۔ جس نے تم سے دشمنی کی وہ بعینہ میرا دشمن ہے۔ تم مطمئن رہو عنقریب اور بھی عمدہ اوستاد فوجی تمہارے پاس بھیجونگا۔ تاکہ ایسا سامان حرب تمہارے پاس تیار ہوجائے کہ پھر کوئی یکبوس تمہاری طرف چشم حسرت سے بھی نہ دیکھ سکے۔

لیکن یہاں جو ایک فوج ینگچری[1] کے نام سے تھی۔ اور کبھی کبھی بدتمیزی و شورہ پشتی اون سے ہوجایا کرتی تھی۔ جو جہالت و الکھڑپن کا لازمی جزء ہے اوس کی طرف سے سلطان کی نظر سرد ہونے لگی۔ اور نئی فوج جس کا کہ نام نظام تھا مورد عنایات خسروانی ہوئی یہ امر فوج ینگچری پر اور بھی شاق گذرا۔ ایک تو وہ لباس

[1] بُرا لہوس۔ بہت لالچی، بے حد طامع، نہایت حریص [2] یعنی چرمی سپاہ (فرنگستان یعنی یورپ کے مسلموں کا لشکر جو سلاطین ترکی کی خاص فوج شمار ہوتا تھا)۔

نصرانی دیکھکر گھبراتے تھے۔ دوسرے اس لئے اسلحہ سے اون کو وحشت تھی تیسری قواعد نصارے کو رقص سے تعبیر کرتے تھے۔ یہی تین وجوہ اون کے بچان کے لئے کب کہتے تھے جو عدم الطاف خسروانہ کا جو تھا دھونس بھی اون پر پڑا۔

نیکچری کی جماعت ایک بڑی بہادر و جاں باز جماعت تھی۔ سلاطین عثمانیہ کا یہ دستور تھا کہ فوجی خدمت کے لئے شریف و نجیب اشخاص جنکی عمر پندرہ برس سے پچیس برس تک ہوتی منتخب کرکے مامور کرتے۔ اور فوج کا نام نیکچری ہوتا ہنگ کے معنی نئے اور تازہ کے ہیں اور چری بمعنی جوان یہ لفظ ترکی ہے پھر بعد میں جب ان سپاہیوں کی اولادیں پھیلیں تو اس قوم کا نام نیکچری ہوگیا اب جو قوم کہ ایک مدت سے سلطنت کی علم بردار رہی ہو اس کو ان واقعات سے جو صدمہ پہونچ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس پر جہالت و بے علمی۔ سپاہ منشی کے ساتھ جہالت ایک عجب سم قاتل ہے۔ بہرحال اس جماعت نے علمائے وقت سے یہ سوال کیا کہ لباس نصارٰی اختیار کرنا اور اون جیسی صورت بنانا کیا مذہب اسلام میں روا ہے۔ علمانے فتوئے عدم جواز کا دیا۔

شیخ الاسلام مع ایک گروہ علما سلطان[1] کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ لباس نصارٰی و تقلید عیسائیت مذہب اسلام ہرگز روا نہیں رکھتا ہے۔ آپ اس خیال سے باز آئیں ورنہ خوف فتنہ ہے۔ سلطان نے اسپر التفات نفرمایا۔

نتیجہ اس کا ایک شر عظیم کا بپا ہونا تھا سو ہوا۔ بڑے بڑے ارکین دولت[2] قتل ہوئے اور سلطان بموجب فتوئے علمائے استنبول تخت سے اتارے گئے شیخ الاسلام نے تخت سلطان کے پاس جاکر معزول سلطان سلیم[3] و شاہی مصطفےٰ[4] خاں رابع کا فتوئے سنایا اور نہایت ہی تحسر و تاسف سے سلطان معزول کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ آپکی امیر المومنین ہونے کا خیال رکھا مگر اسلام کے حق سے چشم پوشی فرمائی۔

---

[1] سلطان محمد سلیم خان ثالث [2] دولت بمعنی حکومت، سلطنت [3] شاہی۔ حکومت، حکم رانی [4] سلطان محمد مصطفےٰ خان رابع ۱۸۰۷ء سے ۱۸۰۸ء تک

بعد اس کے کہ سلطان محمد سلیم خاں سلطنت سے معزول ہو کر قید کیا گیا اور محمد مصطفےٰ خاں تخت عثمانیہ پر متمکن ہوا۔ چاہئے تھا کہ سلطان محمد مصطفےٰ خاں اصل اصلاح کو سمجھ کر ایسی حکمت مدبرانہ اختیار کرتا جس سے فوج نئے اسلحہ کا استعمال شروع کر دیتی۔ یا فوج ہی اس امر کو سمجھ لیتی کہ اوزار و اسلحہ کے استعمال کو مذہب سے کیا علاقہ۔ ہم جس وضع و جس قومیت کا ہتھیار چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس کہ نہ سلطان نے سمجھا۔ نہ رعایا سے اس حکم سلطانی کی رعایت ہو سکی۔ بڑی غلطی سلطان کی یہ تھی کہ تبدیل اسلحہ کے ساتھ تغیر لباس کا بھی حکم تھا۔ جس سے بجز نقصان کسی طرح کے نفع کی امید کچھ بھی نہ تھی۔ اور رعایا کو اس لباس سے مانوس و مالوف کرنے کے لئے امرائے سلطنت نے لباس و وضع یورپین اختیار کر لی تھی۔ اس کا کوئی مفید نتیجہ تو نکلا نہیں ہاں عسکری نے یہ جان لیا کہ اب ہم بیدین کئے جاتے ہیں۔ اور علمائے وقت کو بھی اسی لباس کے باعث مخالفت تھی۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ مذہب اسلام درزی کی مقراض سے نہ بنتا ہے نہ قطع ہوتا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی خیال کر لینے کی بات ہے کہ تہذیب و شائستگی و مدنی کچھ فلٹ ہیٹ کی دوکان سے طیار ہو کر نہیں آجاتی ہیں۔

اسلام نے لباس کے باب میں اسقدر ضرور اصلاح کی ہے کہ متکبرانہ و بے ستر و بیحیائی کا جامہ نہو۔ اور یہ ایک کامل مذہب کا فرض تھا۔ باقی کسی خاص شخص کو لباس میں کچھ بھی دخل نہیں دیا۔ ہاں شارع علیہ السلام کا لباس بیشک مسنون و موجب اجر عبا۔ جبہ۔ تہبند و قمیص عربی مسنون و محبوب مگر فرض و واجب نہیں۔

رہیں وہ احادیث جنہیں اغیار کے طرز و وضع سے شارع علیہ السلام نے ہمیں منع فرمایا ہے اس میں اہم ایک نکتہ سیاسی مخفی ہے۔ ایک قوم جب دوسری قوم کی وضع اختیار کرتی ہے تو اس سے ایک بڑا حصہ دولت کا عسکر اس قوم تک پہنچ جاتا ہے جسکی وضع اختیار کی گئی تھی۔ اور آہستہ آہستہ اس قوم میں جمود و تقلید کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے

رانیں پیٹے گا بہ معمار حرم سلطان عبدالمجید اول (۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء تا ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء) ۹ جون ۱۸۶۱ء مدینہ منورہ میں سلطان کی کثر یادگاریں ہیں۔ طوائف الملوکی سے قبل مرتب کی جانے والی تصنیف الحج (طبع دہلی ۱۹۲۸ء) میں مولانا سلیمان اشرف نے دور عثمانیہ کی حرمین

جس سے صنعت و حرفت کی کساد بازاری اور ایجاد و اختراع کا استیصال بالکلیہ ہو جاتا ہے۔ اس امر کی بڑی دلیل خود ہندوستان و ہندوستانی ہیں۔ اب جبکہ یورپین تمدن ان پر چھا گیا۔ اور ان کے خصوصیات قومی و ملی یورپ میں جذب ہو کر فنا ہو گئی تو انکی آنکھیں کھلیں۔ اب جو دیکھتے ہیں تو جنبش کی طاقت تک نہ رہی۔ گھبرا کر کوئی سودیشی سودیشی پکارنے لگا کسی نے بائیکاٹ یورپ بائیکاٹ یورپ کی ہانک لگا دی مگر اس سے ہوتا کیا ہے (ع) گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر۔

اسی طرح اور بہت مصالح دینی و دنیوی اون کلمات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ہیں یہاں چونکہ لباس کی بحث مقصود نہیں اس لئے اصل مدعا کی طرف متوجہ ہوتا ہوں بلطان اگر تبدیل لباس پر زور نہ دیتا تو ضرور علما کی جماعت اُس کے ساتھ ہو جاتی۔ جنگی ہاتھ میں عوام ہمیشہ رہے ہیں۔ مگر نہ سلطان کا اصرار کم ہوا نہ اون کے انکار میں ضعف آیا مصطفےٰ خاں نظام فوج کی طیاری میں ہمہ تن مصروف و متوجہ ہو گیا اور فوج ینگچری بگڑ کھڑی ہوئی یہاں تک کہ مصطفےٰ خاں[1] نے سلیم خاں کو قید خانہ میں قتل کرایا اور خود ہاتھ میں باغیوں کے گرفتار ہوا[2]

اس کے بعد سلطان محمود خاں ثانی[3] کو رعایا نے اپنا بادشاہ بنایا۔ اسنے اپنے کو ایک عجب خصیت پایا۔ اگر جدید آلات جو اصول سائنٹیفک پر ایجاد ہوئے ہیں استعمال کرا تا ہے تو فوج میں کھلبلی پڑتی ہے اور اگر انھیں دقیانوسی ہتھیاروں پر اکتفا کرتا ہے۔ تو دشمنوں کے حربے کل کے عوض آج ہی فنا کئے دیتے ہیں کرے تو کیا کرے۔ آخر مجبور ہو کر نظام فوج کی طیاری اسنے بھی مقدم رکھی۔ اس کا پھوڑی نتیجہ ہوا جو ہوتا آرہا تھا۔ غرض سلطان محمود نے اس دفعہ یہ حکم اپنے تمام سلطنت میں تاکید شائع کر دیا کہ جہاں کہیں ینگچری کا کوئی شخص ہو وہیں وہ قتل کیا جائے۔

اس شاہی حکم نے جہان نثاران ینگچری سے ممالک سلطانی کو خالی کر دیا۔ اب

---

[1] سلطان مصطفےٰ رابع (۱۸۰۷ء-۱۸۰۸ء) [2] سلطان سلیم خاں ثالث (۱۷۸۹-۱۸۰۷ء)

[3] بقول رضا بیگ مدیر مکش، ترکی میں اس وقت اصلاحات کے حامیوں اور رجعت پسندوں کے درمیان اقتدار حاصل کرنے کی کشمکش بڑے زور سے شروع ہو چکی تھی۔ یعنی چری یا ینگچری فوج کی وجہ سے

واضح ہو کہ سلطان عبدالحمید خاں کے قتل کے بعد سلطان مصطفےٰ رابع کو تخت سلطنت پر بٹھایا گیا۔ اور ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء کو سلطان محمود خان ثانی تخت نشین ہوا۔ (تاریخ اسلام ترجمہ اردو صفحہ ۱۳۹)

سلطان[1] محمد سلیم ثالث کے وقت سے یورپ کے تغلب و تفوق کی قطعی مقبوضات اسلامیہ پر چلنا شروع ہوئی۔ اور ہر دفعہ کوئی نہ کوئی قیمتی جزائر اسلامی سلطنت کا جدا ہو جاتا۔ اب جبکہ یورپ کی دوستی و محبت اعیان دولت و امرائے سلطنت کے دل میں پیدا ہو گئی تو ان کے خصوصیات قومی بھی آہستہ آہستہ یورپ میں جذب ہوتے گئے۔ بالآخر وہی وضع و لباس و معاشرت جس پر کسی زمانہ میں تعصب کا یہ زور شور تھا کہ ملک کی روح اس پر نثار کر دی گئی اور اوسے اختیار نہ کیا۔ اب اوسی پر ایسی فریفتگی ہوئی کہ اپنے خصائص بھی اوس کے پیچھے کھو بیٹھے۔ نئی روشنی کی وہ جھلک اُن کے آنکھوں میں سمائی۔ کہ نور ایمان تو ان سے مفقود ہو گیا اب فیشن و آزادی اور تدین سے بے پروائی ایک بہت خوشنما مطلوب معلوم ہونے لگا۔ اخلاص و مودت سے تو پہلے ہی ہاتھ اُٹھائے بیٹھے تھے۔ اب ملت و مذہب سے بھی ایسی دوری ہو گئی کہ فرائض و واجبات تک انھیں خلاف تہذیب عمل و حشیانہ معلوم ہونے لگے۔ مقصود تو نئی تعلیم سے مقابلہ اقوام عیسائی کا تھا سو وہ تو حاصل نہ ہوا ہاں رہا سہا دین و مذہب تھا سو آزادی اور یوروپین تہذیب کا پوڈر اوس پر لگا کر اوس کی صورت بھی مسخ کر دی۔ اب کیا تھا۔ ؎

پہلے ہی سے نہ تھی میری کچھ قدر و منزلت ✦ پر شب کی مستی نے ڈبو دی رہی سہی

رشوت ستانی۔ ملک فروشی۔ ملت فراموشی ان سب آفتوں میں مبتلا ہو گئے۔ اب یہ ہونے لگا کہ یوروپین اقوام سے اعیان[2] دولت اسلامیہ اشرفیاں لیتے ہیں اور اپنے ملک اپنے بھائیوں کو ان کے حوالہ کرتے جاتے ہیں۔ اسلام کو اقوام غیر سے اُسقدر جان ستاں صدمہ نہیں پہونچا جیسا کہ خود مسلمانوں کے ہاتھ سے اسے زخم کاری لگتا رہا۔ وہ مسلمان ہی تو ہیں جن کی بدولت دولت عباسیہ کا چراغ گل ہو گیا ہندوستان کی یہ فلاکت زدہ حالت ہو گئی۔ سلطنت عثمانی اطراف ذبح کیجا رہی ہے۔ ایران یوں تباہ ہو رہا ہے سچ ہے ؎ ہر کس از دست غیر نالہ کند ✦ سعدی از دست خویشتن فریاد

[1] سلطان محمد سلیم ثالث (۱۷۸۹ء-۱۸۰۷ء) تک مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی یہی ہے کہ یہ کسی غیر قوم کی طرف اس غرض سے بڑھتے ہیں کہ اپنی حیات دنیا سنوارنے کا طریقہ اس سے سیکھیں لیکن اس پیشکش کردہ اُن سائل و اسباب پر اپنی مستقر دین و مذہب پہلے کھو بیٹھتے ہیں مسلمانوں کا ایک عہد عیسائیت کے ساتھ عشق و

ان تمام طویل واقعات دولت عثمانیہ کے لکھنے سے مقصود یہ تھا تاکہ مسلمان یہ سمجھ لیں کہ تعلیمات الٰہیہ سے الگ ہو کر کوئی سلامتی و امن کی راہ نہ پائیگے۔ اس زمانے خصوصاً دفتر میں جبکہ انجمنوں اور کانفرنسوں کی کوئی حد باقی نہیں رہی اور ہر روز وہاں دنیا ایسے کا موضوع قوم و ترقی قوم ہی ہوتا ہے اور جابجا اسکول و کالج کی صورتیں بھی دکھائی دے رہی ہیں۔ اور ان کا نام لفظ اسلامیہ کا اضافہ کر کے ذی شوکت بھی بنا ہوا ہے۔ اور ماشاء اللہ۔ بی۔ اے وام۔ اے۔ بلکہ ڈی۔ ایس۔ سی۔ وپے۔ ایچ۔ ڈی ایک کافی تعداد میں مسلمانوں کے طبقہ میں موجود بھی ہیں۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں اگر ہم یہ کہیں کہ ہند کے مسلمانوں نے ترقی کی راہ پائی۔ اور اب یہ بیدار ہو گئے ہیں۔ لیکن آپ مجھے معاف رکھیں۔ ان چیزوں کے وجود کا نام ترقی اسلامی نہیں ہے۔

ہست[1] اسلام سیرت نیکو + نہ بیں جامہ و قدد دلجو

اس دو سال کے عرصہ میں جو دو لڑائیاں طرابلس و بلقان کی ہوئیں۔ اور اول میں نئے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے چندہ جمع کر کے اور کچھ جلسوں میں گرما گرم لکچر و تقریر و رزولیوشن پاس کر کے کچھ حصہ لیا۔ تو بعض سطحی خیال کے اشخاص یہ خیال کرنے لگے۔ کہ اگرچہ اس جماعت میں نماز روزہ و دیگر اعمال کا فقدان پایا جاتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جذبات قومی تو ان میں زندہ ہو گئے اب قوم کے مردہ دلوں کو یہ زندہ کرینگے۔ لیکن دوستو۔ یہ سخت مغالطہ ہے جذبہ سیاسی اور ہے اور جذبۂ ملی اور۔ ملکی حقوق کا طلب کرنا۔ اور مالی نقصان یا جاہ کی کمی سے بلبلا اوٹھنا ایک امر آخر ہے اور اسلامی شعار کو مٹتے دیکھکر خصائص اسلامیہ کو تباہی میں مبتلا پا کر بیکل ہو جانا کچھ اور ہی چیز ہے۔

صلاح[2] کار کجا و من خراب کجا + ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ہم جبکہ تعلیم یورپ کے بدولت نہ صرف کتاب اللہ سے بیخبر اپنے پیغمبر کے احوال و فضائل

---

[1] اسلام تو اچھی سیرت کا نام ہے۔ نہ کہ لباس اور قد محبوب و معشوق سے متعلق ہے۔

[2] خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں: کام کی نیکی کہاں اور میں رند کہاں؛ دیکھ! راستہ کا فرق کہاں سے کہاں تک ہے

سے الگ۔ خانہ اور سے نا آشنا۔ بلکہ گریزاں ہوں۔ تو پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ملت ہم جنسیت پر مبنی ہے۔ کیا ہماری قومیت کسی خاص ملک۔ خاص زبان۔ خاص نسل اور خاص موقوت ہے یا ہماری قومیت کسی اور شے سے ماورا ہے۔

دوستو سنو۔ ہماری قومیت کی حالت تمام دیگر اقوام سے جدا اور سب سے زیادہ مجموب و گریز ہے۔ ارشاد اور ان حالات پر غور کرو تو کہیں ہم وطنی ایک دوسرے کا ہم قوم بنا سکتی ہوگی۔ کہیں اتحاد زبان۔ کہیں یکرنگی شکل و صورت۔ پھر یا وہ ہم قوم ہونے کے تو دیگر اقوام میں شامل کرنے سے ہیں۔ اسی کو اوٹے سے ایسا بڑا تاکر کہیں کے ہاگے جس سے ہم قومی پوشاک تیار آ ہو گا۔ لے

لیکن ہم مسلمانوں کی قومیت مذہب اور صرف مذہب ہے۔ ہماری قومیت کی بنا اسلام اور ایمان سے قائم و دائم ہے۔ جس قدر قوی ایمانی و جذبات اسلامی ہم میں متصور ہوں گے اسی قدر ہماری قومیت قوی و مستحکم ہوگی اور جتنا اس میں اضمحلال پیدا ہوگا اتنا ہی ہماری قومیت سست و ناتواں رہے گی۔

اور اسی باعث ہو کر ہماری قومیت صرف اسلام و ایمان ہی سے ہے۔ ایک ہندی ایک عرب کا ایک امریکن کو ایک افریقی کا ایک چینی کو ایک شامی کا ایک یورپین کو ایک ایشیائی کا ایک مسلم کو ایک سیدھے سادے کلمہ گو طیبہ کا پڑھنا ہم قوم بنا دیتا ہے۔ ایک کا فرصد سالہ جس وقت اس مقدس کلمہ کی تلاوت کی تو مسلمانوں کی قومیت میں داخل ہو گیا۔ اور ان تمام ہندوؤں کا بلا استثناء دعوے کے ساتھ حق ہو جاتا ہے جس ہندوؤں کا بنی شاہ علیہ السلام نے قرآن اور خدا مسلمانوں کو چھوڑا ہے۔

اس نے قرن اولے کے مسلمانوں میں امتیاز اسود و احمر قریش و عرب و عجم۔ فرق سلطان و گدا ہرگز نہ پاؤ گے۔ ہاں جس میں تقوے زیادہ تھا وہی سب کا پیشوا تھا۔ ان کی کوشش یہ تھا کہ۔ جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا۔ اپنے جذبات نفسانیہ کو اطاعت الٰہی سے کچلنے والا

لہ وطنی قومیت کی اگر اسلام میں گنجائش ہوتی تو سب سے پہلے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرب کے مختلف قبیلوں کو جو آپس میں ہر وقت برسر پیکار تھے "عربیت" کے نام پر متحد کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ ... اور اس طرح کی کوشش فرما کر اس وقت بھی ساری دنیا کے مسلمانوں کو متحد کر سکتے تھے

تھا وہی سردار دیش رہا مانا جاتا تھا۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۔[1]

تو ہم گردن از حکم داور نہ پیچ ✦ کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

شاہ ایک واقعہ جو نوادر عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سنو۔ ملتان کا بادشاہ جیلان ایم مرتد ہو کر دین عیسائی پر قبول کر لیتا ہے۔ اس کے ارتداد کا سبب یہ ہوا کہ کسی موقع پر اس کا ہاں ایک خوب رو عرب کے قدم پر ایسا پڑا کہ کچل گیا۔ عرب نے بھاگ کر ایک ملاچھ اس کے کنہ پر مار دیا۔ مقدمہ حضرت ابو عبیدہ کے پاس پہونچا۔ انہوں نے فرمایا کہ تم بھی ملاچھ کا بدلا ایک ملاچھ مار کر لیلو مگر اس نے کہا کہ میں بادشاہ ہوں۔ اور ایسے سادہ سے ہو لے اول کر ایک عربی عرب کی ہے اس کا عوض عرب ملاچھ کیونکر ہو سکتا ہے اس کو قتل کرنا چاہئے۔ ورنہ کم از کم ہاتھ تو قلم کاٹ ڈالا جائے۔

ابو عبیدہ نے فرمایا کہ اسلام میں جس جرم کی جو سزا مقرر ہے وہ ہر کہ و مہ کیلئے یکساں ہے جو تادیہ مقرر کر دیتے ہیں اس میں مفلس سلطان پہلو بہ پہلو ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ غریب مجرم کی سزا وہی ہو اور اسی جرم کا مرتکب اگر امیر یا بادشاہ ہو تو اس کی سزا میں تخفیف کر دیجائے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ مفلس عرب کے ملاچھ مارنے کا جرم موجب قطع ید ہو۔ اسلام نے ہر برکت دان کر اپنے ماننے والوں کے لئے رکھے ہیں اس میں سب برابر ہیں۔ یہ بات جیلان ایم کو ناپسند آئی اور عیسائیت کی طرف مرتد ہو گیا۔ مسلمانوں کو اس کے ارتداد سے حسرت ضرور ہوئی مگر یہ کسی طرح گوارا نہ کر سکے کہ ایک غریب سلطان جرم سے زائد سزا پائے اور محض ایک بڑے آدمی کے دل دہی کے باعث ایک سلطان پر ظلم کی چھری چل جائے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ قرن اولے کے مسلمانوں نے جس طرف رخ کیا فتح و نصرت نے قدم چومے دنیا کے بڑے بڑے ملک ان کے ہاتھ آئے۔ قیصر و کسریٰ کے تخت نے تہ و بالا ہو گئے۔ بیت المقدس کی کنجیاں خود حضرت

---

[1] (سورۃ نازعات ۴۰۔ ۴۱) اور وہ جو خوف زدہ ہوا اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے (اپنے نفس (اتارہ) کو (اس کی خواہش سے) روکا، تو بیشک جنت ہی (اس کی) ٹھکانا ہے۔

✦ نفسِ عورتی کو مارا نفسِ امارہ کو گورمارا۔ علامہ سیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر تو خواہد

دشمن ہاتھوں کی دست بوس ہوئیں۔ اسلام کی برتری و عظمت محبت کے ساتھ غیر اقوام کے دلوں میں جگہ پا گئی۔ چنانچہ یہ برسوں کی لڑائی جس کو تمام یورپی دنیا سے جوق در جوق نومسلم حمایت صلیبیوں میں جمع کر رہا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ اور سالار اسلام کا قیام اور سوقت حمص میں تھا۔ اس کے باشندے عیسائی دیہاتی تھے۔ حضرت ابوعبیدہ کو جس نوع وہاں سے اوٹھ جانا پڑا۔ اور جزیہ جو وہاں کے باشندوں سے لیتے تھے وہ ان کو واپس دیدیا اس لئے کہ جزیہ لینے سے ان کی حفاظت واجب ہو جاتی تھی اور اس وقت کہ مسلمانوں کو اپنی ہی حفاظت دشوار تھی۔ کسی اور کی حفاظت کا بوجھ کیونکر اٹھا سکتے تھے۔

لشکر اسلامی کے رخصت کے وقت اہالیان حمص میں سے عیسائی رو رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ خدا تمکو واپس لائے اور جلد لائے۔ یہود کہتے تھے کہ توریت کی قسم جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ ورنہ لشکر اسلام تمام شہر کا اس کو اپنے ہاتھ سے حوالہ کرنا آہ و زاری کرتا ہوا چھوڑ کر رہا ہو گیا۔ اب قیصر کا حال سنئے۔ وہ اپنے اعیان دولت سے کہتا ہے۔ کہ عرب تم سے دولت میں جمعیت میں ساز و سامان میں کہیں۔ پھر تم کیوں غالب آتے جاتے ہیں۔ اس کا جواب ایک عیسائی سردار نے وہ دیا ہے کہ عرب کے اخلاق ہمارے اخلاق سے بدرجہا بہتر ہیں۔ وہ راتوں کو عبادت سے زندہ رہتے ہیں۔ آپس میں سچے رہتے ہیں۔ مخلوق کی صلاح و فلاح کی تدبیریں ہوتی رہتی ہیں کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ آپس میں ایک دوسرے سے بحیثیت مساوات کے برتتے ہیں۔ ہماری یہ حالت ہے کہ شراب پیتے ہیں بدکاریاں کرتے ہیں اقرار کی پابندی نہیں کرتے اور ہر ایک پر ظلم کرتے ہیں۔

اس واقعے سے قیصر پر خوب معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسلمانوں کی زندگی و فتوحات کا راز کیا ہے۔ کیسا عیسائی مغلوب پر نیچا ہوا ہے۔ کہ ہر سردار قیصر جیسے بادشاہ کو ایک بڑی عیسائی سلطنت کی اس طرح اخلاقی مدد سے کر کے جواب دندان شکن دیتا ہے۔ (الفضل ما شہدت بہ الاعداء)

(واقعات حمص صفحہ ۱۲۳): ان کے آثار میں کوئی نمایاں فرق آخر نہیں آتا۔ اموی سلطنت کی جگہ عباسی سلطنت قائم ہونے سے صرف اتنی تبدیلی ہوئی کہ حکومت ایک خاندان سے نکل کر دوسرے خاندان میں چلی گئی۔ (سید سرور)

(چراغ حسن، "تاریخ اسلام" طبع لاہور ۸-۲۰ء، ص ۵-۱ و ۱۹۳)

میں رعایا دوسری جانب متوجہ ہونے لگی۔ یہیں سے سلطنت کی حکومت اور مذہب کی حکومت الگ الگ ہوگئیں۔ جن کے ہاتھوں میں بادشاہی فرمان تھا۔ ان کے پاس مذہب کا مقدس فتوے دتھا۔ اور جن کے ہاتھوں میں مذہب کی باگ تھی ان کے پاس دولت کا سرمایہ رہتا تھا۔ وہاں عیش پرستی کے ولولے تھے۔ اور یہاں سوز و گداز کے گریے۔

سلطنت اپنے ہوائے نفسانی کا تکملہ چاہتی تھی۔ اور دیانت مذہب اور شریعت کے تازیانے سے تحریک کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ مذہب کا سوالی اپنی گردن دوسرے کے زور کے حوالے کر دیتا ہے

ترک جہان و ترک مال و ترک سر ۴ ورطۂ عشق اول منزل ست

اکثر ائمہ اہل بیت کو صحیح تر یا زہر عداوت ہی سے شہید ہوتے ہوئے پاؤ گے۔ اسی طرح علمائے اہل بیت کو سلاطین کے دست تعدی کا دل دیں گرفتار دیکھو گے۔ تھوڑے دنوں تک ایسی ایک برگزیدہ جماعت دنیا میں قائم رہی جس کا ظاہر و باطن دونوں علم و معرفت سے لبریز تھا۔ اور اس جماعت نے اسلام کی حمایت میں بہت سے سلاطین کے احکام جابرانہ کی مخالفت کی۔ ان کا قول تھا کہ ؎

گر برائے ترک ترکم او بر تارک نہند ترک تارک گیرم و او را نہ گیرم ترک ترک

آخر کہاں تک اس جماعت کے گھٹ جانے کے بعد اب ایسے اشخاص بھی پیدا ہوئے جو احکام شرعی کو سلاطین کے ہوائے نفسانی کا تابع قرار دینے لگے۔ اور دولت کے طمع میں دین کی حرمت سے ہاتھ اٹھا بیٹھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عامۂ مسلمین میں دین کی طرف سے جرم پوشی ہوا ئی شروع ہو گئی۔ خود ایسے مدعیان علم جو کہ دعائی نذر سے کھاتے تھے۔ اس لئے احکام شرعی کے کھا تو ڑنے میں تامل کرتے۔ اور ایک مدت تک ان کی بے پروائی اور بے عصبیت کا اثر عوام میں پھیلا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عوام اب علماء کے نام سے وحشت اور دین کے نام سے تبرا کرنے لگے۔

---

۴ ترک عشق جس کسی مرد (جان مال اور سر سے ہاتھ دھونا) اور اس مسلک ترک کرنے سے مقصود (دست برداری کرنا) تعدی کیا ہے جاؤ کہ ترک اس کو کہتے ہیں کہ جس کے بعد اس کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ "الصبر کی الجماد کھلا ہے عشق سلطان جابر" یعنی افضل ترین جہاد سلطان

یہ حالت اگرچہ اسلامی ملک کی تباہی و بربادی کی ہوئی۔ لیکن جہاں کہیں بھی کہ مسلمانوں کی حالت اسلامی حیثیت سے خراب ہوئی ہے وہاں یہی علت پاؤ گے پہلے امراء مگن پر کچھ دینی الشیخ علم کا طبقہ ان کے ہاتھوں کا رومال بنا۔ اور ان دونوں نے مل کر عوام کو تباہ و برباد کیا۔

پس اے عزیز۔ اس پر یہ علت تاک لو اور جس جگہ تمہاری ایک بیار سلطنت ہے خلافت کا منصب حاصل ہے چلو استاد دنیا صلی اللہ علیہ وسلم کا جادہ پر کش۔ دعوم عزم کا خادم ہے اس کا نام اپنی پر آشوب گرد آلود دنیا ہے۔ کیا اس وقت بھی آرام کی خواب فراموش میں پڑے سوتے رہو گے۔ کیا اب بھی اپنی حالت نہ بدلو گے۔ کب تک آرام کو جاں کہو گے اور آرام طلبیوں کو کافر کہیں گے۔ ہائے اس کشاکش نے یہاں تک تو فگار کر دیا اس حد تک تو شاید کیا اب بھی انہیں فضولیات میں وقت ضرف کرتے رہو گے۔ ہائے کیا

شعر ہے

آنکھیں کہیں کہ دل نے ہمیں کیا خراب کیا ۔۔۔ دل یہ کہے کہ آنکھوں نے مجھ کو ڈبو دیا
مجھ کو کسی کا کچھ نہ گلہ ہے نہ شکایت ہے ۔۔۔ دونوں کی خلد نے خاک میں ہمکو ملو دیا

اسلامی نوں خدا کا کلام تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا عملی نمونہ تمہارے سامنے ہے۔ پھر تمہیں کیا ڈر ہے اٹھو کمر باندھو اور اپنی حالت کو سنبھالو یہ گناہوں کی زندگی جو تم بسر کر رہے ہو صدق دل سے توبہ کرو۔ اور اس کی رحمت کا پتے اعمال حسنہ سے اپنی جانب توجہ کرو۔ نا امیدی کی کیا بات ہے جس ذات نے ابراہیم خلیل اللہ کو نمرود سے۔ بنی اسرائیل کو فرعون سے۔ عرب کی قوموں کو کفر و شرک سے نجات دی تھی آج بھی وہ مصیبت دوراں پر دین آفات سے نجات دینے کو موجود ہے۔ اگر ہم اپنے اخلاق اپنے اعمال آج درست کر لیں تو پھر وہی اسلامی برکتیں ہو جائیں۔ اگر ہم میں تقوے و خشیت الہٰی پیدا ہو جائے تو آج پھر ہماری وہی ہیبت وہی دبدبہ دنیا مانے لگے جو کبھی تسلیم کیا جاتی تھی

لہ "سوچتا ہوں اور شرم سے سر جھکا کر رہ جاتا ہوں کہ اب ہمارے علماء اور زعماء کی آنکھ کھلے گی یا نہیں" یہ جملہ ہمیں سوچنے کو مجبور کرتا ہے۔ کون ہے اس کا جواب اور کہاں ہے ملے جواب اے کہ "قومیں جب اپنا وقار کھو دیتی ہیں تو سب سے پہلے اس قوم کے ارباب اقتدار اور

کیونکہ ہمارا مذہب اسلام ہے۔ اور اسے خداوند عالم نے دنیا میں اس صفت کے ساتھ بھیجا ہے لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ پھر کیا وجہ کہ وہ غلبہ نصیب نہ ہو کیا تیرہ سو برس گذر جانے سے اسلام وہ اسلام نہ رہا۔ کیا یہ وہی پاک اسلام نہیں ہے جس نے صدیوں کی لڑائیاں دم کے دم میں چکا دی تھیں۔ کیا وہی اسلام نہیں ہے جس نے خون کے پیاسے دشمنوں کو ایک دوسرے کا عاشق زار و جان نثار بنا دیا تھا۔ کیا یہ وہی اسلام نہیں ہے جس نے دنیا میں قدم رکھتے ہی تاریکی روشنی سے جفا وفا سے قطع وصل سے فساد صلح سے عداوت محبت سے ذلت عزت سے خیانت امانت سے معصیت طاعت سے کدورت صفائی سے بدل کر دنیا کا رنگ ہی پلٹ دیا تھا اور دنیا کے سارے رنگوں کو اللہ کے خوشنما رنگ میں رنگ دیا تھا۔

اسلام تو بیشک ہی اسلام ہے تیری ہی شان۔ تیرا ہی غلبہ۔ تیری ہی عزت۔ تیری ہی برکات۔ لیکن یہ تمنی کہ ہمیں میں قابلیت تجھ سے مستفید و مستفیض ہونے کی باقی نہ رہی۔ لیکن پھر بھی ناامید ہونا تیری تعلیم کے خلاف ہے۔

ارجنیں محسن نہ شاید ناامید
دست در فتراک رحمتہا زنید
بعد نومیدی بسے امیدہاست[1]
وز پس ظلمت بسے خورشیدہاست۔

واللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی من ہو الاول والآخر والظاہر والباطن وہو بکل شیء علیم علی الہ وصحبہ واولیاء امتہ وعلینا معہم اجمعین۔

حررہ بقلم فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہ

[1] اس قسم کے محسن سے کبھی بھی ناامید نہیں ہونا چاہیے اس کی رحمت کے فتراک کو ہاتھ لگائے نومیدی و مایوسی کے بعد ہی بہت سی امیدیں ہوتی ہیں اور تاریکی و ظلمت کے پیچھے ہمیشہ سے سورج پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ۱۲ تا کرائے غالب کردے ہر دین پر (التوبہ، ۳۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

اسلام و خلافت

اسلام

ایسے زمانۂ شور و فتن میں جبکہ ہر طرف آوازۂ مادہ و من بلند ہو۔ صدق و حقانیت کی دلکش صورت پردۂ تدلیس و نقابِ باطل سے رُوپوش کر دی گئی ہو۔ اور ہر سر برآوردہ طبقہ ایسی عزت کی تحصیل میں جو اُسکے اختراعیاتِ محضہ میں سے ہے اِسطرح سرگرم و منہمک ہو کہ تمام حق اللہ و حق العباد کو پسِ پشت ڈال رکھا ہو کچھ لکھنا یا بولنا ایک فعلِ عبث میں داخل ہے۔

ہاں اِسوقت ایسے مضامین کا جو رضی اعزہ کو موقر۔ تن پروری کو خیر خواہیِ اُمّت۔ جھوٹے جاہ کو عزتِ حقیقی۔ الحاد کو ایمان۔ ترکِ فرائض و واجبات کو تہذیب و روشن خیالی ثابت کریں۔ تیز تحریر میں آتا چلتی گاڑی کی رفتار کو بڑھانا اور اپنے آپ کو اُسی سلک میں منسلک کرنا ہے۔ اور جو مضامین کہ اِس رنگ کے نہوں وہ نظرِ حقارت کے سپرد۔ جہالت و وحشت سے ملقب کئے جانے کے قابل ہیں۔

لیکن ایک ایسا شخص جو قعرِ گمنامی میں ایک ٹوٹے بوریے پر زندگی بسر کرتا ہو۔ اگر ایسی علیق رکھ دے یا کہہ گذرے جسکے صلے میں بجائے آفرین و مرحبا کے نفرت و ملامت کا اظہار کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جسکا وجود و عدم سکوت و کلام یکساں حکم رکھتا ہو ایسے شخص کی بات سے

قول ہو ناخوہ اپنی زندگی کے لمحات کو تباہ کرتا ہے ؎

فیا لھنیا اھل العقید نعیمھا ۔۔۔ وللعاشق المسکین ما یتجرع

اے اہل بیت تمہیں تمہاری نعمتیں مبارک مسکین عاشق کو تو غم گھونٹ پینے ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اس مضمون کی تو ہم کی نگاہوں میں اسقدر وقعت ہی نہ ہوگی کہ ایک مرتبہ نگاہ حقارت ہی سے سہی دیکھا جاتا نصیب ہو لیکن پھر بھی میں اسکے لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا ہے

دو چیز طیرِ لاہوتی اس دم ذوق شنید ۔۔۔ بوئے گلستان و گفتن برقت خاموشی

اسوقت جو ضلال کہ مذہب اسلام پر طاری ہے۔ وہ نتیجہ ہے اسی مجموعہ خموشی کا اور ثمرہ ہے بے اثر تقریر کا۔ اتفاق جن کیلئے زنار بیگانگ اور اہل زمانہ کا نام ہو گرد نہ دیکھنا چاہیئے اور جنہوں نے کہ اُسے سچائی اور دیانت پر مبنی ہی نظر رہ ورکھا۔

پس جبھی حیات سے بھرپور ہو کر نتیجہ نے بھی بیسویں صدی کو ایک اتفاقی نور سے چمکا چند سطریں بلکہ گرد اشش مرد اتفی کی کر دی ہے۔ اب ارباب ایمان جو چاہیں وہ کہیں اپنی اپنی جگہ اسکان قیاس پر مبنی ہے جبکہ اسوقت مسلمانوں کو صرف اس کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے کہ جدا سے کہ کسی شخص نے کلمہ شہادت کی تصدیق دل سے اور اقرار زبان سے کر لیا اُس پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اس تصدیق کے آثار اُسکے افعال و اخلال سے صادر ہو کریں۔ اور اگر کوئی شخص ایسا پیش آجائے کہ جو اظہار کا مرادم ہو تو اُسے رفع کرے۔ مثلاً حکومتوں کی کشمکش سے دست کش ہونا ایک بہت ہی اہم دعوہ کہ آثار امر ہے۔ اسلئے اسلام نے مذہب کا بازو سیاست سے قوی کر دیا۔ تاکہ خدمتِ تبلیغ و ترغیب و اقناع میں اگر کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ تو وہ سیاست اسے محو و کالعدم کر دے۔

جو مذہب اپنی حفاظت نہیں کر سکتا اور اپنی مامون زندگی کیلئے طاقت و اختیار نہیں رکھتا ہے اسکا وجود کوائف عادیہ میں سے ہے اور وہ ایک فلسفہ خیال سے زائد مرتبہ نہیں رکھتا۔

وہ واقعہ جس میں اخلاق حسنہ کی کتاب ہو۔ خاتمہ ہی مقدس و واجب التعظیم ہے۔

آسکو پوسہ دیتے آنکھوں پر رکھتے لیکن سلامت ہی لانہ رہ سکتا تھا جس میں نوجوانوں کو شیر کا تصور دکھلائی دیتے ہوں وہ پاکیزہ اخلاق کی کیا تعلیم دیتا ہے اور پھر اس کتاب مجرم پر عقیدہ رکھنے والے اب مسلمان بھی کہلاتے ہیں

آنکہ بگوید آں بسر دشمن باد را ایں دارد و آں بسر ہم

لیکن یہ احادیث صحیحہ کی تصریح ہے کہ ان کی زندگی کا مقدس کامل نمونہ عملی و قولی تعلیمات اسلامیہ کی پوری تفسیر تھی کما قالت عائشۃ رضی اللہ عنہا کان خلقہ القرآن۔ پھر خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا زمانہ اس امر کی شہادت دیتا ہے۔ جو جو ملک روی و ایرانی نے قائم کر رکھے تھے۔ رحمۃ اللہ و رضوانہ اللہ علیہ۔

اسلام کے محافظ اعوان و انصار کا ایک بڑا اصل بیت المال اور دیگر اتحاد مسلمانوں کا مرکز ہونا چاہئے تھا اس مرکز کی حفاظت جان سے زیادہ عزیز سمجھنا یعنی بیت اللہ اور بیت النبی یعنی حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی حفاظت جان سے زیادہ اسلامیوں کے مرکز تھے۔ وہ گئے۔ وہ ذات بابرکات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دونوں جگہوں کی حفاظت اور مسلمانوں کی پیشوائی کے لئے ان کا آدمی تھا۔

کتب احادیث و سیر کے پڑھنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں کہ شریعت کی دلیری اسی ذات سے تھی کہ کیسے ہی موقع پر دشمن کے مقابلہ سے نہ ہٹتے تھا میدان جنگ میں وہ ہی ایک جرأت سے بھرپور دکھلائی دیتا۔ انتظامات ملکی میں ایک بڑا برتر سلطان تھا۔ ارتباط باہمی و سیاسات کے فیصل کرنے میں ایک بے نظیر حاکم عادل تھا پھر باوجود ان تمام بلندیوں کے خوبیوں کے وہ اپنے آپ کو خادم اور اپنے غلاموں پر نوازش کرنے والا سمجھتا تھا۔ ایسی ہی صفت میں اسے یکہ و تنہا جانا کہ اجنبی کو پوچھنے کی ضرورت ہوتی کہ تم اسے دیکھ کر کون ہے۔ وہ اپنے خلق بگوشوں کی ہمت افزائی اس محبت سے کرتا کہ بیگانہ آشنا ہو جاتا۔ وہ اپنے خلق کو ناصح مشفق مربی کا جب پتہ دیتا۔ الخ

لے جیسا کہ اقبال 'جاوید نامہ' میں درج کرتے ہیں۔

گفت اگر راز دل من داری شیر سوئے این مشعیرہ ایں قرآن مبر
ایں دو قوت حافظ یک دیگر اند کائنات زندگی را محور اند!

تعالےٰ علیہ وعلےٰ آلہ واصحابہ الف الف صلوٰۃ۔

دنیا میں دو طرح کے مذہب پائے جاتے ہیں۔ ایک مذہب تو ایسا ہی کہ جسکے اصول سُننے میں تو بہت خوشگوار اور سرسری نگاہ میں نہایت ہی دلپذیر۔ مگر جب اُن اصول پر کوئی زندگی بسر کرنا چاہے۔ اور اپنے مذہبی معلومات پر عمل کی بنیاد قائم کرنا چاہے تو سانس تنگ اینی دشوار ہو جائے۔ پھر اُن اصول پر اگر گہری نظر حکیمانہ ڈالی جائے تو تمام اصول کنبج العنکبوت ہو جائیں جیسا کہ مذہب عیسائی۔ انکا اصل دینی ایک تو یہ ہے کہ اپنے جانی دشمن کے لیے بھی ویسی ہی سچے دل سے دعا مانگو جیسا اپنے اکلوتے فرزند کے لیے دعائے خیر کرتے۔ دوسرا اصل مانہی یہ ہے کہ اگر کوئی تمہارے ایک رخسارے پر طمانچہ مارے تو تم دوسرا رخسارہ بھی پیش کر دو۔

اب یہ اصول ایسے ہیں کہ بجز اسکے کہ کتابوں میں مکتوب رہیں اپنے متبعین کی عملی صورت میں کبھی نمایاں نہیں ہو سکتے۔ بخلاف اسکے مذہب اسلام ہے۔ جسکا ہر اصل قابل عمل۔ اور نہ صرف قابل عمل بلکہ وہ اپنے متبعین کو اس امر کا بھی حکم دیتا ہے کہ اگر اطاعت الٰہی میں کوئی مانع تمہیں پیش آجائے تو اُسے بزور دفع کر دو۔ سب سے پہلا دشمن جو صراط الٰہی میں ہمارا سدِ راہ ہوتا ہے وہ نفس امّارہ ہے۔ جو لذاتِ دُنیاوی و فانی عزت و جاہ پر مٹتا ہوتا ہے۔ شارع علیہ السّلام نے بآواز بلند فرمایا کہ اعدا عدوک الذی بین جنبیک۔ یعنی سب سے بڑا دشمن تمہارا تمہارے پہلو میں نفس امّارہ ہے۔

دوسری حدیث میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔ المجاھد من جاھد لنفسہ والمھاجر من ھجر ما نھی اللہ ورسولہ عنہ۔ یعنی مجاہد تو وہی ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہو اور مہاجر وہ ہی جس نے اُن چیزوں کو چھوڑ دیا۔ جسکے ترک کے لئے اللہ اور اُسکے رسول نے حکم فرمایا۔ سچ ہے۔ ایک لشکر پر ہزار کا شمشیر دینا اور برہنہ شمشیر سے نہ گھبرانا اُسقدر دشوار نہیں جسقدر اپنے نفس کے حملوں کو روک لینا معرکۃ الآرا ہے۔ اسیطرح یہ بھی حق ہے کہ مقاماتِ مقدسہ پر نجس دل و گندی روح لیکر جانا اور مہاجر کا معزز لقب اپنے لیے سزاوار و لائق جاننا

اک سراسر شوخ چشمی ہے ۔

طوافِ کعبہ رفتم بہ حرم رہم ندادند کہ برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی[1]

ایک اور حدیث سنو۔

الایمان بضع وسبعون شعبة فافضلها قول لا الٰہ الا اللہ وادناها اماطة الاذیٰ عن الطریق۔ یعنی شجرِ ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں سب میں افضل و برتر قولِ لا الٰہ الا اللہ کا کہنا اور سب شاخوں میں ادنے شاخ ایمان کی یہ ہے کہ راہ میں سے اذیت دہ چیز کا نشان دینا۔ محدثین محققین اذیت دہ چیز نفسِ امارہ کو قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جسطرح شاہ راہ سے کانٹا و پتھر ہٹا دینا شفقۃً علی الخلق موجبِ اجر ہے اسیطرح صراطِ مستقیم جو موصل الی الحق ہے اُسپر موذی نفس بیٹھا ہوا ہے اُسے ہٹا دو۔ تاکہ انوار و تجلیات تمہاری ارواح پر تابان و درخشاں ہوں۔ الحق ۔

حجاب و پردہ نہ دارد نگارِ دلکش ما تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز[2]

ان احادیث سے تمہیں بخوبی معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ اپنے اخلاق کو درست بنانا اور نفس کی بیجا خواہشوں کو پامال کرنا مختلف عنوانات سے شارع علیہ السلام نے ہمیں بتلایا اور سکھایا اور نیز اپنی مقدس زندگی میں اپنے افعال و طرزِ معاشرت سے ہمیں ہر سنّت کو کر کے دکھلا بھی گئے اور کچھ اس شفقت و محبت سوز و گداز کے ساتھ ہمیں یہ علمی و عملی درس آپنے تعلیم فرمایا کہ ع۔

ذرہ ذرہ سے ہوا شورِ اَنَا الشمس بلند

پیغمبر فرمایا رب العزۃ نے اپنے کلام پاک میں ——— یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔[3]

تیس پر کا زمانہ دیکھو اور پھر تعلیم رسالت کی تاثیر و تقدیر کیطرف غور کرو۔ تو ایک سراسر اعجاز ہی اعجاز دکھلائی دیتا ہے۔ جو قوم لکھنے پڑھنے کو شغل کمینہ پیشہ کنش و وزی وغیرہ کے نسبت جانتی ہوا سکو علم کا ایسا گرویدہ بنا دینا کہ اُس قوم کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہونا کسی قوم کو اب تک نصیب

---

[1] (فخر الدین عراقی رح) یہ تجارہ کعبہ کے طواف کے لیے گیا تو انہوں نے مجھے حرم شریف جانے کے لیے راستہ نہ دیا کہ باہر کیا کرتے رہے ہو جواب انہوں نے دیا جو آپ حافظ شیرازی رح) دلوں جانظر ترجمہ قاضی سجاد حسین مدراس شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح رقم ہے مسلمان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست عاشق اور معشوق کو درمیان کوئی آڑ نہیں ہے۔

دنیا۔ یہ خاصہ صرف اسی نبی اُمّی کا تھا جسکو خدا نے عرب کے وحشی پہاڑوں میں تمام عالم کی ہدایت کیلئے پیدا فرمایا تھا۔ وَعَلَیٰ آلِہٖ الْکِرَامِ الْمُطَہَّرِیْنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ آنَاءَ اللَّیْلِ وَاَطْرَافَ النَّہَارِ اَبَدًا وَاَبَدَ الْاٰبِدِیْنَ وَدَوَامَ مُلْکِ اللّٰہِ۔

اب بعد اسکے کہ فیضِ مسیحی منقطع و زائل ہو گیا۔ دیگر تمام نوعِ انسان اگر وحشی پر آلودہ ہو جائیں۔ اور دین کی راہیں بجائے آپس میں سیدھ راہ ہونے کے ٹیڑھی ہو جائیں۔ تو ہرگز ممکن نہیں کہ خدا انہیں گمراہ چھوڑ دے اور انکا کسٹر کر دے کیونکہ ہر زمانہ میں ہم تعلیم موجودہ اسلام میں بیان کر چکے ہیں۔

اسجگہ بیان کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کسی مذہب کا بیکار ہو جانا یا بیکار ہو سکنا ہے۔ پس اسلام کے جتنے اصول ہیں سب قابلِ عمل اور گرانقدر اصول ہیں کسی کا بھی ایک ذرہ ان اصول پر عمل کرنے سے حیات دنیا مقبول اور آخرت محمود۔ زمانی مصلح اور دینی خلق خدا کے لئے ہر زمانہ میں شبانی تجلیات اسلام کے نور چہرے پر انوار و خیرات لاجرم ہوں گے تو یہ باری کہ اسی ہو گی نہ اسلام کی تفسیر و کوتاہی ہے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ۔۔۔ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اب میں بالبداہت دعوے کے بے نہایت استقلال کے ساتھ اسلام کے اصول کو رکھتا ہوں بلکہ اسی طرح بیان کر جاتا ہوں کہ اسلامی ہیئت میں سے بیکار کرنی ہے کر دیجئے۔ اور فلاح عباد میں سے کسی چیز کی احتیاج ہو۔ ایک ثلث کے بجائے اس کے نہیں کوئی ایسا کوئی اصول پر گزار کار نہیں۔

غور کرو اصول اسلام کے تین ہیں۔ تصحیح اعتقاد۔ تہذیب الاخلاق۔ اصلاح اعمال۔ اعمال کی دو قسمیں۔ عبادات و معاملات۔ پھر معاملات کی چند قسمیں ہیں۔ تعاملیہ۔ مدنیہ۔ سیاسیہ۔ حربیہ۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسلام بلا شبہ یہ سکھاتا ہے کہ اپنے عقیدے کو درست کرو جب تک عقائد درست نہ ہونگے آسودگی تک عمل کا کوئی اعتبار نہیں۔ پھر عقائد کے بعد اُن پر اخلاق کی

(سعدی شیرازی) اگر دن کے وقت چمگادڑ کو دکھائی نہیں دیتا تو اس میں سورج کا کیا گناہ ہے کہ اس کی آنکھ میں چمگادڑ کو دکھائی نہیں دیتا۔ ت۔ ا۔ انکار کرنا۔ ز۔ ناقابلِ رہنما

درستگی۔ اعمال کی آرائش و زیبائش کا بھی حکم دیتا ہے۔ اعمال میں سب سے پہلے خدا کی عبادت ہے اس کے بعد اپنے دنیاوی معاملات۔ اور ان معاملات کی بہت سی قسمیں ہیں۔ کسی کا تعلق بدن سے ہوتا ہے کسی کا سیاست و پالیٹکس سے کسی کا تجارت سے کسی کا باہمی ملاقات سے

یہ جملہ اقسام اوّل و ثانوی وغیرہ میں نے بیان کیے۔ ان سب کا ماخذ اوّلاً کلام اللہ ثانیاً حدیث رسول ہے اگر ڈھونڈا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ کیسے کیسے قانون اور کیسے کیسے شرعی فیصلے موجود ہیں۔ یہ تمام تفصیلات نقہ کی ہمگر مست نہیں ہیں۔ بلکہ قانون خداوندی سے مستنبط ہیں۔ خدا کی کتاب قرآن مجید میں تمام دنیوی سعادت و دینی نجات کی طرف رہبری کی گئی ہے پھر احادیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اُسکی تشریح و توضیح ہے۔ ہاں یہ نکتہ البتہ قابل اضافہ کہ قاعدہ، عبادات و تہذیب اخلاق و تدبیر منزل کے متعلق ہیں جملہ اصناف اضافہ میں بالتفصیل تمام مسائل بتائے گئے اسقدر تفصیل کے ساتھ احکام معاملات صادر نہیں ہوئے۔ بلکہ اگو جملہ کلیہ کے بیان فرمادیا۔ مثلاً توحید و نبوت معاملات و نبوت۔ معاد و حشر کے مسائل کو جناب باری سے مختلف عنوانات سے جابجا گزرنگوں دوائی کیساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ جب تک ان ارکان ثلثہ پر ایمان و اعتقاد کامل نہیں ہوتا۔ آسوقت تک انسان عقیدت انسانی کے پایہ تک عروج نہیں ہوگا۔ اسکے بعد تہذیب اخلاق کا سبق سیکھایا ہے تاکہ ہر جملہ و اوصاف سے خصلت اور بری عادتوں سے پاک و صاف ہو جائیں۔ اسکے بعد اُن حقوق و واجبات کا ہیں درس دیا گیا ہے جو ایک کنبے کے لوگوں میں باہمی تعلقات و قرابت مندی کے سبب ہوتے ہیں مثلاً باپ۔ بیٹا۔ ماں۔ بیوی اولاد۔ خادم آقا وغیرہ وغیرہ پھر ہمسایہ۔ دوست۔ خارج از کنبہ جماعتی سبیل اللہ۔ یہ عبادت و حقوق العباد و شائستگی و تہذیب اُن اہم مسائل میں سے ہیں جن سے دنیا محض ناآشنا تھی۔ اور ان کے لیے جو قانون اختراعی وجود سامنہ کی ایک نامکمل صورت

لہ قرآنی آیات اور مجموعہ احادیث کا بہت بڑا حصہ عبادات سے کہیں زیادہ اجتماعی اور معاشی مسائل، حقوق انسانی، اخلاق کے انتقادی امور اور قیام امن انصاف کے لیے لڑائی اور فوج داری قوانین پر مشتمل ہے۔

ہیں تھے وہ بجائے نافع ثابت ہونے کے سخت مضرت رساں تھے۔ فلاطوں جیسے حکماء کو زوال کا ذمہ دار کہتے تھے۔ عام انسانوں سے جیسے زبانی و جسمانی قوتے اٹھے ہوتے وہ خدا کا بیٹا سمجھا جاتا۔ ایسی عادتیں جو اخلاق کے لیے سخت تباہ کن تھیں مثلاً طرب نوشی اکل حرام صوم لذائذ لباست وغیرہ وغیرطیبات ناجائز ہو چکی تھیں۔ عورتوں پر جوائی کے خود ساختہ قانون سے ظلم ہوتا تھا وہ ظاہر ہے۔ عبادات الٰہی کی جو صورت تھی وہ اب بھی غیر مسلم کی عبادت سے عیاں ہے۔ اسلئے ان امور کی اشد ضرورت تھی کہ شارع علیہ السلام یہ تمام رکاوٹیں دور کر کے تمام حقوق و مراتب کا تعین جس انداز سے کر دیں جیسا کہ کلام مجید احادیث شریفہ ان تمام ہدایات سے مالا مال ہیں۔

اب رہے معاملات۔ ان میں بھی وہ حصہ جس میں مبادلات انسانی کا تعلق تھا شارع علیہ السلام نے بالتفصیل بیان فرما دیا۔ مثلاً بیع و ہبہ رہن وغیرہ وغیرہ اب باقی رہیں مشترکہ کی قسمیں جن کا تعلق تمدن سیاست و حرب کے ساتھ تھا۔ چونکہ یہ چیزیں ہمیشہ متغیر و متبدل ہوتی رہتی تھیں اور ان کے لیے عقل انسانی خود کافی تھی۔ جیسے جیسے ضرورت ہوتی جاتی ہے اشیاء کا ایجاد ہوتا جاتا ہے۔ اسلئے اس حصہ معاملات پر کلیۃً شارع علیہ السلام نے چند ہدایتیں فرما دیں اور مابقیہ آئندہ پیش آنے والے اسلوب کے لیے ائمہ اجتہاد مامور فرما کر جدوجہد کو شش و سعی کا دروازہ ہر پر کھول دیا۔

اس امر کے ثبوت میں کہ خداوند تعالیٰ نے جمیع عقائد و مذاہب اخلاق و تدابیر منزل و عبادات کے متعلق بہت ہی مشروح و بسط سے ہمیں احکام اپنے فرقان حمید میں ارشاد فرمائے ہیں کوئی دلیل پیش کرنے کی حاجت نہیں۔ جتنے کلام مجید کی سرسری ترجمے کیساتھ تلاوت کی ہوگی اس پر یہ امر مخفی نہیں۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ دنیا کی عقل ایجاد کرنے سے ایسے سچے عقائد اور اسلوب پاکیزہ اخلاق اور ایسے بہتر اصول تدبیر منزل اور ایسی روح پرور عبادات سے عاجز تھی۔ اور صرف عقل انسانی ایسے زریں دستور معتدل قوانین وضع کرنے سے قاصر تھی۔ اس دعوے کی دلیل

اسوقت بھی کافی ہے۔ کہ جب آفتاب اسلام نے فاران کی چوٹیوں سے طلوع کیا۔ تب دنیا ان اصول سے واقف ہوئی۔

پس جو امور ایسے تھے کہ جن تعلیم الٰہی کامل کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے تھے انھیں تو ارتجائے نے اپنے کلام مجید میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی احادیث میں نہایت بسط و تفصیل کیساتھ بیان فرمادیا۔ لیکن مسائل کے بے شمار تھے۔ انمیں سے بعض کی طرف اشارہ تو بہ تفریق مقتضا کافی تھا۔ کچھ اسے بنا پائے۔ زراعت، صنعت و حرفت اسکو کہ نہ بتلایا اس لیے کہ عقل اسکو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ کس زمانے و کس ملک میں کونسی صنعت و حرفت کی حاجت ہے اور اُسے کس طرح کرنا چاہیے۔

ہاں ایسے ضروریات زندگی جو انسانی حیات کیلئے جزو لاینفک ہیں مثلاً تمدن سیاست آداب۔ اسکو خوب حل فرمادیا۔ اور یہ ایک کامل و صادق مذہب کا فرض تھا۔

احکام شرعیہ سے جو حضرات کہ ناواقف ہیں۔ وہ انھیں توفیق اس سے آگاہی کی ابھی نہیں ہوئی۔ وہ بر بنائے اصل مرکب علیہ کہدیتے ہیں کہ اسلام صرف ترکیہ نفس سکھلاتا ہے دنیاوی امور میں کوئی اصل نہیں۔ اس تیرھویں صدی میں جبکہ اتحاد اہل کی گفتگو مسلمانوں پر اثر کی بجلیاں کیطرح چمکائی ہوئی ہو اسطرح کی آوازیں اور بھی اسلام سے بے پروا کرنیوالی ہیں۔ لہذا یہ بتلا دینا کہ اسلام ہی ہے جس نے تمدن، سیاست، حرب تمام دنیا کو سکھلایا۔ ایک نہایت ضروری بات ہے۔

اُصول تمدن اور اسلام

تمدن کا سب سے پہلا اصل خوبی ہے یہ ایک ایسی صفت ہے کہ جب تک انسان کو یہ حاصل نہیں ہرگز وہ تمدن کی راہ پا نہیں سکتا۔ اسلام سے پیشتر دنیا جس تاریکی و جہالت میں مبتلا تھی اسکی تفصیلوں میں پہل نہیں بھی تھی۔ کہ آزادی کا شرف مفقود و غلامی کے ذلیل و خوار طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے تھے ہر زبردست نے اپنے زیر دستوں کی شرافت و خوبی

ط عقل اللعم آنکس کہ داند و بداند کہ داند — در جہل مرکب ابد الدہر بماند

جو شخص کہ نہیں جانتا اور جانتا ہے کہ نہیں جانتا ہوں وہ شخص جہل مرکب میں ہمیشہ رہیگا

جوہر یعنی نوعِ انسان کا ہی سلب کر کے انھیں اپنا بندہ بنا لیا تھا۔ ہر ایک اہلِ دولت ہر ایک ذی حشمت بجائے خود انا ربکم الاعلیٰ کا مدعی تھا اور دیگر ابنائے جنس اس کی پرستش میں مصروف تھے۔ تمام شریف جذبات اس ذلیل و برباد کن حکومت نے قوموں میں سے سلب کر لیے تھے۔

اسلام کے بخشے ہی یہ راز تو لوگوں پر بڑوں منکشف ہوا کہ اس خاتم النبیین نے تو کہے کی جوت رب العالمین کی یہ خوش آیند بشارت سُنا کر تھی اور ہزاری عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آدم کو پیدا فرمائے گا یعنی ہم نے فرزند آدم کو عظمت و کرامت عطا کی ہے۔

پھر دوسرا خطاب یوں عطا ہوا وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ اس آیہ میں سے یہ معلوم ہوا کہ انسان خلیفۃ اللہ ہے یعنی تمام کائنات پر جائز تصرف کرنے کے لیے خدا نے اسے بھیجا ہے پھر فرمایا وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ۔ خشکی و تری کے فرزند آدم سب نعمتوں کے حق دار ہیں۔ پھر جو تیسری خوش خبری دی وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تفضیلاً۔ یعنی جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب تمھارا مسخر ہے۔ وہ تمھارے لیے ہیں تم اس کے مسخر ہو۔ قالبوں میں جان آگئی۔ اور انسان نے اپنی قوت و کرامت پر اطلاع پائی۔ اسی لیے ہم نے کہا تھا اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ لوگو یہ بزرگیاں جو تمھیں عطا ہوئی ہیں اگر ان کا تمھیں علم نہ تھا جاہتے ہو تو اب سکی عبادت کرو جو دیدہ بینا کل تک بھی پھر پا نہ سکے گا

ابلہ باد بہ دشت و خورِ شبہ فلک کارند تا تو نانے بہ کفِ آری و بہ غفلت نخوری

بہ ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

ان آیات سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنیہ کا سبق اسلام اور صرف اسلام ہی نے دنیا کو سکھایا ہے کہ تو ہی رب کی عبادت کا جو حکم دیا ہے اس میں اس نے کیسی لطیف اشارہ بھی فرمایا ہے کہ شرافت انسانی اس امر کی مقتضی ہے کہ جو سر اپنے رب کے سوا نے پر جھکا ہوا ہے کسی بشر کے جناب میں خم ہونا چاہیے۔ بلکہ

لہ (سعدی شیرازی) باول ہوا چاند اسکا اور آسمان سب صوف کار ہیں تار تو روٹی حاصل کرنے کے بعد اسے خلعت سے نوازا ہے۔ یہ سب (جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) تیرے خدمتگار ہیں اور فرمانبردار ہیں۔ اب اگر تو فرمانبرداری اختیار کرے تو

تمام سلاطین و امرا، و ارباب دول کے آستانوں سے متکبرانہ گذر جانا چاہیے جس سے ایک بہت ہی بڑا سبق خود داری کا ہمیں ملتا ہے۔

خود داری یا سلف پیپکٹ ایک دوسرا اصل تمدن کا ہے اَلْعِزَّةُ لِلّٰہِ وَلِرَسُوْلِہٖ میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو چکا تھا۔ اب دوسری آیتوں میں مومنین کی اسی صفت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا (یعنی تمہیں میں نے ایسی اُمت بنایا ہے جیسی نہ افراط ہے نہ تفریط۔ بلکہ وسط و اعتدال ہے تاکہ تم دوسروں پر گواہ بنو اور پیغمبر تم پر گواہ ہو سکے۔ پھر ارشاد فرمایا۔ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ کہ دربار احدیت سے حکم الحاکمین نے عزت کا لباس عزت مومنین ہی کو عطا فرمایا ہے۔

دوستو! اج تمہیں یہ فیصلہ ٹھہرانا ہیں کہ دہ لگتی۔ کیا اسلام سے پیشتر دنیا اس عزت و اسقلی جرثیۃ سے آشنا تھی۔ حاشا و کلا کبھی نہیں ہرگز نہیں۔ قیصر و کسریٰ شاہنشاہ کا نام آتے ہی اور بے اختیار دلوں کا ہم عزت تھا سنو! اور خوب یاد رکھو کہ حقیقی عزت تو وہ ہے جو ہدیۂ ایمانی حاصل کرتا ہو۔ ساز و سامان دولت و حشمت کے طفیل میں معزز نہ بنایا نہ فریب جس سے بقبول خوائی ہو جاتا ہو جھوٹی عزت و مقبولیت ہے۔ سچی عزت تو وہ کہ جو میسر آتی ہے جو تولے، اتوال و افعال پر حکم پا جائے جس پر ایمان حاصل کرے اور ایک روحانی سرور حاصل ہو اور یہ عزت تو صرف مومنین ہی کو آقائے دو عالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل میں نصیب ہوئی ؎

محمد عربی کہ آبروئے ہر دو سراست
کسیکہ خاک درش نیست خاک بر سر او

تیسرا اصل تمدن کا یہ ہے کہ ہر شخص کو موقع جنبش و حرکت کا دیا جائے۔ اسلام سے پیشتر جتنے قوانین سلطانی و آسمانی دنیا کے سامنے پیش کیے جاتے تھے ان میں عقل انسانی کو کوئی دخل نہ دیا جا سکتا تھا۔ اور یہ سمجھنے کی بات ہے کہ جب تک عقل کا کام نہ لیا

لہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں جہان کی عزت و آبرو ہیں جو کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے در کی خاک نہیں ہے اس کے سر پر خاک۔ (دیوان حافظ مطبع نامی منشی نول کشور کانپور ۱۹۱۲ء) ۲ پ سورۃ البقرۃ، ۳ پ سورۃ آل عمران ۸

اُسوقت تک تمدنی حیات حاصل ہو نہیں سکتی۔ یہ سبق بھی قرآن مجید ہی سے دنیا نے سیکھا ہے۔ وائیکل و توراۃ موجودہ کو دیکھو پھر قرآن کیطرف نظر کرو۔ یہ کلام قدیم لم یزل ولا یزال اس طرح ارشاد فرماتا ہے[1] لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحیٰی من حی عن بینۃ۔ یعنی جو شخص ہلاک ہو تو ہوالا وہ حجۃ تمام ہونے کے بعد ہلاک ہو۔ اور جو زندہ رہنے والا ہے وہ بھی حجۃ تمام ہونے کے بعد زندہ رہے جاہلانہ عقل سے کام لینے پر تاسف[2] ارشاد فرماتا ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ۔ یعنی عقل سے فکر سے تدبر سے کیوں کام نہیں لیتے۔ اور اہل ایمان کی یوں مدح سرائی فرماتا ہے کہ وہ آیات الٰہیہ کو سُنکر عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اندھے بہرے بنکر اُسپر نہیں گرتے۔ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا[3] لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اور منصوعات عالم میں صانع حقیقی کی صنعت قدرت کا مطالعہ نہیں کرتے اُنھیں یوں ذکر فرماتا ہے۔ وَکَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْھَا وَھُمْ عَنْھَا مُعْرِضُوْنَ[4] یعنی آسمان و زمین میں بہت سی نشانیوں پر سے گذرتے ہیں مگر منہ پھیرے ہوئے ایسے لوگوں کی ان الفاظ شدید میں تمہید فرماتا ہے۔ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا[5] یعنی جس نے دنیا میں عقل کی آنکھیں کھولیں وہ قیامت میں بھی گمراہ و اندھا ہی رہیگا۔ نجات کی راہ پا نہیں سکتا ہے۔ ؎

ہر کہ امروزنہ بیند اثر قدرت ما ۔۔۔ غالب آنست کہ فرداش نہ بیند دیدار[1]

چوتھا اصل تمدن کا علم ہے۔ جب تک علم نہیں اُسوقت تک تمدن ایک جسم بے روح ہے اسلام نے جس شدومد کے ساتھ علم کی تاکید فرمائی ہے اُسکے بیان کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ علم کی اہمیت اسلام نے کسقدر رکھی ہے اُسکے لیے میں صرف دو آیتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ پہلی آیت تو وہ ہے جس سے ابتدا وحی کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہوئی۔ اُس آیت کے پہلے لفظ کو دیکھو معلوم ہو جائیگا کہ علم کا پایہ اسلام نے کیا قرار دیا۔ ارشاد باری ہے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ[2] سب سے پہلی وحی آتی ہے اُسکا پہلا لفظ یہ ہے کہ اِقْرَاْ یعنی پڑھ

[1] جو کوئی آج اُس کی قدرت و طاقت کی نشانیاں اور علامات نہیں دیکھتا تو اس کے لیے زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ کل یعنی روز قیامت بھی اس کے دیدار سے محروم رہے گا۔ [2] سورۃ انفال ۴۲ [3] سورۃ شعرآء ۷۳ [4] سورۃ یوسف ۱۰۵

[5] سورۃ بنی اسرائیل ۷۲ [6] سورۃ علق ۱

پھر ایک دوسری جگہ اپنے محب و محبوب رسول کو یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا یعنی اے محبوب یوں کہیئے کہ اے رب میرے علم کو زیادہ کردے۔ یہ نکتہ سمجھنے کے قابل ہے کہ محبوب رب العلمین وہ دعا فرماتے ہیں اور وہ چیز مانگتے ہیں جسکو خود اُن کے خالق نے طلب کرنے کو بتلائی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا سائل۔ علم جیسی شے سکول۔ اور رب العزت جیسا دعا سُننے والا اور دینے والا۔ اُس علم کا مُبدء و منتہٰے کون بتلا سکتا ہے۔

فَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ[1]

پانچویں اصل یہ ہے۔ کہ افراد قوم میں تقسیم عمل ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی شخص تمام کاموں کو انجام دے۔ کوئی صنعت و حرفت میں مشغول ہو۔ کوئی تجارت میں مصروف رہے۔ کچھ لوگ زراعت پیشہ ہوں۔ کچھ افراد علوم دین کے ماہرین کی ہو۔ علماء اُن لوگوں کو جو کاروبار دنیا میں مصروف ہیں مسائل شرعیہ بتلائیں۔ تاکہ انھاک فی الدنیا نہ پائے جو موجب ہلاکت ہے۔ ارشاد باری ہوتا ہے[2] فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ۔ یعنی ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہر گروہ میں سے کچھ لوگ علم دین سیکھنے کو نکل کھڑے ہوں۔ اور جب سیکھ کر اپنی جماعت میں آئیں تو انھیں خلاف مرضیات الٰہی سے ڈرائیں۔ تاکہ اُنکی زندگی و کاروبار دنیاوی اللہ کی مرضی کے موافق ہوں اگر ہر گروہ میں سے کچھ لوگ علم دین سیکھنے کو نکل کھڑے ہوں۔ اور جب سیکھ کر اپنی جماعت میں آئیں تو انھیں خلاف مرضیات الٰہی سے ڈرائیں۔ تاکہ اُنکی زندگی و کاروبار دنیاوی اللہ کی مرضی کے موافق ہوں اگر ہر گروہ میں سے کچھ لوگ علم دین سیکھنے کو نکل کھڑے ہوں۔ اور جب سیکھ کر اپنی جماعت میں آئیں تو انھیں خلاف مرضیات الٰہی سے ڈرائیں۔ تاکہ اُنکی زندگی و کاروبار دنیاوی اللہ کی مرضی کے موافق ہوں اگر ہر کام تقسیم ہو جائے تو نظام عالم کا سلسلہ کیا عمدہ منتظم ہو جاتا ہے۔

اسلام تو ہمیں سب کچھ ترقی و تہذیب و تمدن کی باتیں بتلاتا ہے مگر ہم اپنے نشہ غفلت میں ایسے سرشار ہیں کہ ایک قدم بھی اُسکے بتائے ہوئے رستے پر نہیں رکھتے۔ زراعت چھوڑی۔ صنعت و حرفت ترک کی۔ تجارت سے بیزار ہوئے۔ اسکا لازمی نتیجہ افلاس و نکبت تھا سو مسلمانوں پر چھا کر رہا۔ کیا اللہ تعالےٰ نے اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ فرما کر تجارت کی رغبت نہیں دلائی۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مقدس زندگی میں تجارت نفرمائی۔ کیا خلفائے راشدین اسے نہ کرتے تھے۔ ہائے افسوس مسلمان اب بھی بیدار نہیں ہوتے

---

[1] سورۃ طٰہٰ، ۱۱۴ [2] کیونکہ دنیا و آخرت آپ ہی کے جود و عطا سے (قائم) ہیں اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم میں سے ہے (یعنی دنیا کا قیام اور آخرت کا برپا کیا جانا ذات رسالت پناہی کے باعث ہوا اور لوح محفوظ پر قلم سے لکھا ہوا جو علم معرفت ہے وہ آپ کے علوم کا ایک حصہ ہے)۔ [2] سورۃ التوبہ، ۱۲۲

دیکھ رہے ہیں کہ اسی تجارت نے یورپ کو سلطنت عطا کر دی۔ اور اسی کے نے مسلمانوں کو غلام بنا دیا۔ مگر پھر بھی آنکھ نہیں کھولتے۔ نہ مسلمانوں میں علمائے ربانی رہے الا ماشاء اللہ نہ انہیں زراعت و تجارت صنعت و حرفت ہی رہی الا ماشاء اللہ۔ چلو فرصت ہوئی۔ جب اعمال ہی نہیں رہے تو پھر تقسیم کس کی ہو۔ اِنَّا لِلّٰہِ ثُمَّ اِنَّا لِلّٰہِ۔

چھٹا اصل تمدن کا حقوق دینی میں مساوات ہے۔ وہی قوم نفس الامر میں متمدن کہی جا سکتی ہے۔ جس میں وعدہ و وعید ہر فرد قوم کے لیے یکساں ہو۔ جس جرم کی جو سزا مقرر ہو وہ سلطان و گدا، اشراف و احلاف دونوں کے لیے یکساں ہو۔ قرآن مجید نے جہاں کہیں کوئی وعدہ فرمایا ہے اس میں کوئی خصوصیت دولت یا نسب کی نہیں پائی جاتی ہے۔ اور یہی حال قرآنی وعیدات کا ہے۔

یہ ایک ایسا بدیہی مسئلہ اسلام کا ہے اور اس کثرت سے قرآن اور نے اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ ہر پڑھا لکھا اسے خوب جانتا ہے کہ نسب و دولت پر اسلامی سزا و جزا مترتب نہیں ہوتا۔ یہاں تقوے و کسب دیکھا جاتا ہے۔ نہ کہ خاندان و نسب۔ ؎

حسنؓ ز بصرہ و بلالؓ از حبش صہیبؓ از رُوم ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست[1]

ساتواں اصل فرق مراتب ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے لہٰذا اسکا لحاظ بہت ضروری ہے جب تک فرق مراتب نہ قائم ہو۔ تمدن کیا خاک ہوگا۔ ع۔ اگر فرق مراتب مٹ نہ زندیقی مختلف زمانوں میں بعض نادانوں نے فرق مراتب کا لحاظ اٹھا دینا چاہا۔ مگر قدرتی فطری باتوں کا اٹھانا انسانی قدرت سے بالاتر ہے اگر فرق مراتب اٹھ جائے تو یکسر گی ترقی کی رفتار رک جائے۔

چونکہ مذہب اسلام چونکہ تمدن کا حامی ہے اس لیے قرآن پاک میں فرق مراتب کو یوں بیان فرمایا نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا[2] ہم نے زندگانی دنیا میں بنی آدم کی

[1] (خواجہ حافظ شیرازیؒ) سرزمین بصرہ سے حسنؓ، سرزمین حبشہ سے بلالؓ اور سرزمین روم سے صہیبؓ جیسے صحابی پیدا ہوئے اور سرزمین مکہ سے ابوجہل یہ کیا بوالعجبی ہے

[2] سورۃ زخرف ۳۲

روزی آپس میں تقسیم کردی ہے۔ اور بعض کو بعض پر بلندی عطا کی تاکہ ایک سے ایک کام لے۔
خداوندِ عالم نے بنی آدم میں محتاج و محتاج الیہ کا ایسا سلسلہ رکھا ہے کہ جس کے باعث ہر بڑے سے بڑا اپنے چھوٹے کا محتاج ہے اور چھوٹا اپنے بڑوں کا۔ اگر تمام انسان ایک ہی حالت پر لے آئے جائیں تو کاموں کا سلسلہ یکبارگی موقوف ہو کر ترقی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس لیے باہم فرق مراتب ضرور ہے پھر جس کو خدا نے جو مرتبہ عطا کیا ہے اُس کے مرتبے کے بموجب اُسکی عزت و احترام کا لحاظ بھی ضروری ہے چھوٹوں کو بزرگوں کی عظمت لازم ہے اور بزرگوں کو اپنے چھوٹوں پر شفقت واجب۔ مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا۔

آٹھواں اصل تمدن کا یہ ہے کہ انسان کا اس پر کامل اعتماد و پختہ یقین ہو کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اُس کا نفع و نقصان اسی کی طرف عائد ہونیوالا ہے جسطرح انسان کو تمام کائنات سے برگزیدگی کا خیال متمدن بناتا ہے اُسیطرح یہ اعتقاد کہ افعال کا سود و زیاں فاعل ہی کو نفس الامر میں پہونچتا ہے انسان کو انسان رکھتا ہے۔ ورنہ بسا اوقات اس اصل سے بے توجہی حیوانیت سے بھی اسفل مرتبے میں انسان کو پہونچا دیتی ہے۔ قرآن نے متعدد مقامات پر نہایت ہی تصریح فرمادی کہ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔[1]

اس مجمل و مختصر بیان سے تمھیں اسقدر تو ضرور معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ آج جو مسلمانوں میں تمدن کے آثار نہیں پائے جاتے وہ نتیجہ ہے احکامِ الٰہی سے غافل و بے پروا ہونے کا مذہب نے تو تعلیم میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ اگر قرآن مجید کا مطالعہ غور سے کرو تو بیشمار تمدن کی باتیں اُس میں پاؤ گے۔ اسیطرح اُن تمام ہدایتوں سے قرآن مالا مال ہے جنکی حیاتِ انسانی کو ضرورت ہے

اسلام اور سیاست

سیاست بجائے خود ایک مستقل فن ہے۔ یہ مختصر تحریر اُسکی متحمل ہو نہیں سکتی۔ لیکن اسقدر کہدینا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک سیاست سلطانی ہے اور ایک سیاست

[1] سورہ بقرۃ : ۲۸۶

مذہبی رہنما سوئٹ جو کچھ کھو نگا وہ مذہبی سیاست کا ایک حصہ ہوگا۔

سیاست کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ملک آبادی کا جن سے تعلق ہو اُن کی رائے و مشورے کو بھی دخل دیا جائے۔ رعایا کی فریاد سُنی جائے۔ واجب شکایتوں کا ازالہ ہو اور غیر واجب چیخ و پکار پر اُن کی فہمائش۔ اسلام نے اپنی سیاست میں اس عنصر کو اسقدر قوی کیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد ہوتا ہے کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اپنے یاروں سے مشورہ کر لیا کرو۔[1] اصحاب باوقار کی یوں مدح سرائی فرماتا ہے۔ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ یعنی اُن کے کام مشورے سے انجام پاتے ہیں۔[2]

اسکی اہمیت قابل غور ہے۔ عہدِ نبوت ہے۔ وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ پیغمبر کو پھر مشورے کی کیا حاجت؟ تمام باتیں بذریعہ وحی کے بتلا دی جاتیں۔ مگر ایسا اگر ہوتا تو لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کی جامعیت مشورے کا خود فعل رسول سے مسنون ہونا کیونکر سمجھا جاتا۔ اسکی اہمیت کسطرح معلوم ہوتی۔ کہ باوجود ہر طرح مشورے سے بے نیاز ہونیکے پھر بھی مشورہ لیکر اپنے غلاموں کو یہ سبق پڑھا گئے کہ کسی بلند مرتبے پر پہونچکر مخلوق خدا کو چھوڑنہ دینا بلکہ جو کام کرنا ہو اُن سے صلاح و مشورہ لیکر کرتے رہنا۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى هٰذَا النَّبِيِّ الْكَرِيْمِ اس زمانے میں مجلس شوریٰ کے صحیح مفہوم کا مسلمانوں کو سمجھنا یا سمجھانا ایک دشوار امر ہو گیا۔ آجکل کمیٹیاں ہوتی ہیں۔ ارباب حل و عقد بیٹھتے ہیں۔ مگر مشورے جسے کہتے ہیں اسکا نام ہی نام ہوتا ہے۔ فریق بندی۔ احباب نوازی۔ اشخاص پرستی سے کام لیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ کمیٹی نے یہ بات طے کی۔ رائے دہندوں کے دروں پر جاتے ہیں اُن کی رائیں قبل سے حاصل کی جاتی ہیں۔ کہیں بذریعہ رُعب۔ کہیں بذریعہ تہدید۔ کہیں بوسطۂ خوشامد و منت۔ اور اس طرح ایک آواز کے پیچھے بہت سی آوازیں ہو جاتی ہیں۔ لیکن اسلامی مشورہ ان تمام آلودگیوں سے ایسا ہی پاک و صاف ہے جس طرح بالوں سے کف دست۔

---

[1] القرآن الحکیم، سورۂ آل عمران ۱۵۹ [2] سورۂ شوریٰ ۳۸ [3] تمہارے لیے بہترین نمونہ رسول کی ذات میں موجود ہے۔ (سورۂ احزاب ۲۱) [4] تہدید۔ ڈرانا، دھمکانا

دوسرا عنصر سیاست کا یہ ہے کہ اشد اور جرائم قانوناً تعزیراً بدرجۂ اتم ہو۔ اسلام نے اوّلاً اجتناب معاصی مثل چوری قمار بازی شراب خوری زنا کاری دروغگوئی غیبت قتل و غارتگری وغیرہ وغیرہ کو نہایت مؤثر پیرائے میں بیان فرمایا۔ پھر اُن شریر النفس لوگوں کے لیے جو زبانی سمجھوتے سے نہیں مانتے۔ حدود تعزیر مقرر فرمائی۔ تاکہ دنیا ایسے ناہنجاروں سے پاک ہو۔ یا کم از کم جرائم کا سدباب ہو اور مخلوق امن و چین سے اپنی زندگی بسر کرے۔ یہاں پر تعزیرات قرآنی کا لکھنا کچھ ضرور نہیں۔ ہر مسلمان جسکو تلاوت قرآن نصیب ہے خوب جانتا ہے۔

نیز تعزیرات قرآنی کے گوناگوں مصالح ایک ہیچمدم حقیقت ہیں سے مخفی نہیں لیکن سزا دینے کے لیے ضرور ہے کہ سزا دہندہ کی طاقت زبردست ہو۔ قانون کا نفاذ بدون قوت ناممکن۔ اسلئے اسلام نے یہ حکم دیا کہ قوی طاقت ہر وقت طیار رہے۔ جسکے باعث اپنی رعایا بھی مؤدب رہیگی اور آس پاس کے دشمن و اغیار بھی مرعوب رہ کر مفسدین کی مدد سے باز رہینگے۔

اسلام اگر صرف تعلیم اخلاق پر اکتفا کرتا۔ اور تعزیر کا تازیانہ شریعت کے ہاتھ میں نہ دیتا تو یہ تعلیم عالم ملکوت کے لیے ہوتی۔ جہاں ہمارے انسانوں کے فرشتوں کی آبادی ہوتی۔ مگر شریعت جبکہ دنیا میں انسانوں کیلئے بھیجی گئی۔ اور اُن میں مختلف اصناف کے بنی آدم ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں جو تعزیر وحد کا کوڑا اسکے دوسرے ہاتھ میں نہ دیا جاتا۔

سیاست کا تیسرا جزیہ ہے کہ ایسی قوت و جمعیت ہو کہ جسے دیکھتے ہی دشمنوں کا کلیجہ پانی ہو جائے قرآن حکم دیتا ہے[1] وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ یعنی ہر طرح کی قوت ممکنہ دفع دشمنان کے لیے ہمیں طیار رکھنا چاہیے ایک ہی قسم کی قوت پر اکتفا نہ چاہیے لفظ قوۃ کو نکرہ لایا تاکہ کسی خاص طرح کی قوت نہ سمجھی جائے یہ چیز ایسی ہے کہ اختلاف زمانے سے مختلف ہوجایا کرتی ہے لہٰذا اسے نکرہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ پھر مَا اسْتَطَعْتُمْ کا لفظ بھی قابل غور ہے مَا عموم کے لیے آتا ہے جس سے یہ مسئلہ بخوبی حل ہو جاتا ہے کہ تمام قوتیں جنکی کہ ہمیں استطاعت ہو موجود رہنی چاہئیں۔ مثلاً تلوار تیر نیزہ

[1] سورۃ انفال، ۶۰

آلاتِ سامان کے لحاظ سے اور بندوق توپ ہوائی جہاز وغیرہ فی الحال دشمن تیار یا طیل
ہیں گھوڑے بندھے ہوئے رہیں یہ نہیں کہ وقتِ ضرورت فراہمی کی جائے نہیں بلکہ ہر وقت
آمادہ رہو۔ تمہارے دشمن اللہ کے دشمن ہیں ہے شک نہ رہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے وَاللّٰہُ مَعَکُمْ
وَلَنْ یَّتِرَکُمْ اَعْمَالَکُمْ یا اَشَدُّ مَنَاصِبَ یَقْدِرُ اَنْ یَّتِرَکُمْ ہے تو اپنا کام کیا ہے جس سے لوگ خوب ہی
واقف ہیں اور اُس سے انسانوں کا فائدہ ہی ہوتا ہے۔ ایک اور بڑے مسلمانوں کو حکم ہوتا ہے۔
وَالْجِدُّوْا فِی اِقَامَۃِ حُدُوْدِہٖ۔ تمہاری حالت ایسی رہنی چاہئے کہ دشمن تم میں کمزوریاں نہ
سمجھ سکیں چاہے کی کمزوریاں نہیں اپنے قدموں کو گیند نہ بنائیں۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
خُذُوْا حِذْرَکُمْ مسلحا کا پاجاؤ ہی رہو۔ غائت و قوت جہاں ساز و سامان و آلات حرب
سے پیدا ہوتی ہے وہاں اتفاق و اتحاد بھی قوت کے ایک بڑا عظیم المقاصد قوت انسانی کی
طرف بھی ہدایت فرماتے ہیں وَلَا تَنَازَعُوْا۔ آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ
رِیْحُکُمْ۔ ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا خیری ہو جائیگی۔ ذاتی خاصات اور مسلک
مخالفت دوسری طرف نہ ہو چھوٹے چھوٹے اختلافی اُمور کو بیچ میں نہ لاؤ۔ سب بکھر ہیں و
ملت کو مضبوط کیے رہو مسلمانوں کے سوا غیر قوموں کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔ ان سے
انہیں کو بے اعتمادی اور دشمن کو قوت ہوتی ہے۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً
مِّنْ دُوْنِکُمْ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ
وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ۔

اے مسلمانو! اپنے لوگ چھوڑ کر مخالفین میں سے کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ کہ یہ تو
تمہاری خرابی میں کچھ اٹھا نہیں رکھتے۔ اغیار تو دل سے چاہتے ہیں کہ تم مصائب میں مبتلا
ہو جاؤ۔ بغض کی باتیں تو اُن کے مُنہ سے نکل ہی پڑتی ہیں اور دل میں جو تم عداوت
کی اُن کے وہ تو کہے دیتی ہے اُسکا کیا پوچھنا۔

یہ سیاست کا بڑا اصول ہے کہ اپنے رموز و اسرار اغیار سے مخفی رکھے جائیں۔ اور اپنے

لہ سورۃ صورۃ ۲۵ ۔ ۲ سورۃ قریش ۱۰۳ ۔ ۳ سورۃ نساء ۷۱ ۔ ۴ سورۃ انفال ۶۰ ۔ ۵ سورۃ
آل عمران ۱۰۳ ۔ ۶ سورۃ نساء ۱۰۲

اپنا خیر خواہ سمجھکر راز دار نہ بنایا جائے۔ کاش مسلمان اب بھی سمجھیں۔

چوتھا اصل سیاست کا یہ ہے کہ اغیار و مخالفین پر چیرہ دستی روکھنے کی کوشش کی جائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکے ان کی منصفانہ نگرانی کیجائے۔ اسکی بابت قرآن یوں حکم دیتا ہے۔ اَنْ یُّعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صَاغِرُوْنَ۔ یعنی جو اسلام قبول نکرے وہ ہمیں تم سے ذلیل کر جزیہ ادا کرے۔ جسے جزیہ لیا جاتا ہے وہ اصطلاح شرع میں ذمی کہے جاتے ہیں۔ اسلام پر اُن کی جان و مال و عزت کی حفاظت ضروری ہو جاتی ہے۔ اُن سے ہر بالغ پر ایک خوج ذمیوں کے ملک میں رکھی جاتی ہے اس سے انکی حفاظت بھی ہوتی ہے اور نگرانی بھی رہتی ہے۔ اسلامی فوج انکے ملک میں پڑی رہتی ہے۔ تاکہ جرمیوں اور بیرونی دشمنوں سے اُن لوگوں کی حفاظت کرے جو اسلام کی امان میں آکر جزیہ ادا کرتے ہیں۔ نیز اگر ذمی کسی وقت سر اُٹھانا چاہیں تو وہیں کی فوج انکو کچل ہی ڈالے۔ اُن کو اسکا موقعہ نہ دے کہ اسباب مہیا کر کے مسلمانوں کا خون بہائیں۔ مگر اس قانون اسلامی پر دولت عثمانیہ کا عمل رہتا تو آج دنیا سے بلغاریہ، سرویا، مونٹی نیگرو اور بلقان سے عورتوں اور بچوں کو اپنی جانکاری کا شکار نکرتے۔ از ماست کہ بر ماست۔

اسلام اور حرب

اسلام نے حرب کو ایسا لازمی و ضروری جز قرار دیا ہے کہ جسکے بغیر حیات اسلامی محال ہے۔ اور حق یہ ہے کہ جس قوم کے پاس اپنی حفاظت و امن کی قوت نہیں اُسکا بقا کسی حیثیت اُس کے مذہب کی اشاعت محال ہی محال ہے۔ اسلئے اسلام نے دو چیزوں کی بحالت حکومت دو نہیں کی ہیں۔ ایک تو وہ جسے صدق و یقین ہو جائے اور دوسرے اگر یہ تو وہ ذی ہیں۔ ان سے نہ جنگ ہے نہ لڑائی مگر ان کے دشمنوں سے اسلامی فوج لڑتی ہے اور انھیں چین سے زندگی بسر کرنی نصیب ہوتی ہے۔

لفظ اللہ قرآن شریف سورۃ توبہ ۲۹ تک جو ہماری طرف سے اس کی ذمہ داری ہم پر ہے

دوسری دو قومیں ہیں جنہوں نے جنگ چھوڑ رکھی ہو یا ہو نیکا امکان ہو انھیں حربی کہتے ہیں۔ انکے لیے قواعد حرب کے بنائے گئے تاکہ لڑائی میں بھی اسلامی اعتدال قائم رہے۔ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ خدا کی راہ میں اُن لوگوں سے جو تم سے لڑیں لڑو۔ مگر حد سے تجاوز نہ ہو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ہے۔ آیت کریمہ کے الفاظ کو غور کرو۔ پہلی تعلیم تو یہ ہو کہ یہ لڑائی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ تکمیل خواہشات نفسانی غلبۂ جنگ نہو۔ پھر دوسری ہدایت یہ ہوئی کہ لڑنے میں حد سے تجاوز نہ ہو۔ بڈھوں بچوں عورتوں خانقاہ نشینوں کو قتل کرنا کہیں شروع نہ کر دو۔ باوجود اسکے کہ وہ دشمن ہیں پھر بھی عدل و انصاف و اعتدال کا ہی حکم ہوتا ہے اور شاد ہوتا ہے لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا۔ کسی قوم کی دشمنی تمکو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف نہ کرو۔ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ۔ عدل کرو کہ یہ شان تقویٰ ہے۔ لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝[1]

اس آیہ کریمہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو قوم مسلمانوں سے مذہبی لڑائی لڑے یا مسلمانوں کو گھروں سے نکالکر بے خانماں بنا دے یا جو مسلمانوں کے نکال دینے پر دشمنانِ اسلام کی مدد کرے اُن سے لڑنا بہت ضرور ہے ورنہ ظالموں میں شمار ہو جائیگا۔

غنیمت است راچو تنہد گئے و بنوازی + بدولتِ تو کہ سیکند بانبازی[2]

ہاں جو قوم مسلمانوں سے صلح و آشتی سے پیش آئے اُن کے ساتھ دنیاوی حسن سلوک اگر کیا جائے تو خدا کو یہ امر پسندیدہ ہے۔ اسلام سے زائد مخلوق پر شفیق و مہربان کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا۔

---

[1] سورۃ بقرہ ۲، ۱۹۰ تا ۱۹۳ [2] ممتحنہ ۸، ۹ [3] شیخ سعدی شیرازی (گلستان باب ۵) جب تو کسی خبیث بدفطرت و شریر شخص کی پرورش کریگا اور اسے نوازے گا اور تیرے بل بوتے پر جو وہ گناہ کرے گا تو بھی اس میں شریک سمجھا جائے گا۔

سلطان صلاح الدین کے زمانے میں[1] جو جنگ صلیبی ہوئی تھی اُسوقت دشمن کی فوج میں ہیضہ پھیلا۔ سلطان صلاح الدین نے چار سو قرآ[2] بے عرقِ گلاب کے فوجِ دشمن میں دوا کے بھیجدیئے۔ دشمن اظہارِ تعجب کرتا ہے۔ سلطان کہتا ہے کہ تم ہمارے ملک میں ہماری تلواروں کے مقابلے میں مرو۔ بیمار ہوکر کیوں مرتے ہو۔ مبارزہ کے وقت تم ہمارے دشمن ہو لیکن بحالتِ علالت مجھ پر تمھاری تیمارداری لازمۂ شفقتِ انسانی ہے جسکی تعلیم اسلام نے اپنے متبعین کو دی ہے اور انھیں میں پائی جاتی ہے۔ مگر جب عیسائیوں نے بیت المقدس فتح کیا، تو چالیس دن تک قتلِ عام جاری رکھا تھا مسلمانوں کے شیر خوار بچے آغوشِ مادر سے چھینکر دیواروں پر اس زور سے مارے جاتے تھے کہ چیک کر رہ جاتے مگر جب صلاح الدین نے بیت المقدس فتح کیا ہے تو چالیس روز تک اذنِ عام دے رکھا کہ جسکا جہاں جی چاہے چلا جائے۔ مسلمانوں میں سفاکی و بیرحمی نہیں ہے۔

ہاں وہ جو ہم سے لڑنے آئے اُس سے لڑنا بہت ضرور ہے۔ حفاظتِ خود اختیاری ایک لازمی شئے ہے۔ لیکن بسا اوقات نفسِ انسان کو اپنی کمزوری بے سروسامانی و قسم قسم کے توہمات دلاکر بزدل بنا دیتا ہے اور ایک بے غیرتی کے سطح پر لے آتا ہے اسلیئے قرآن شریف نہایت مؤثر پیرائے اور ایسے الفاظ میں جو دل میں گھر کر جانیوالے ہیں۔ حفاظتِ خود اختیاری کے لیے عرقِ غیرت کو حرکت میں لاتا ہے اور رگِ حمیت کو جوش دلاتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ اے ایمان والو تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں لڑنیکو نکلو تو تم زمین میں ڈھیر ہوئے جاتے ہو۔ کیا آخرۃ کے بدلے زندگانی دنیا پر قانع ہو گئے ہو۔ آخرۃ کے مقابلے میں سازوسامانِ دنیا بالکل ہی ہیچ ہے اگر اڑنیکو تم

[1] پہلی صلیبی جنگ ۵۸۳ھ مطابق ۱۱۸۷ء، اہل فرنگ کی دوسری صلیبی مہم ۱۱۹۳ء [2] شیشے کی بڑی بوتلیں جسے صرف مسجد صخرہ میں ستر ہزار مسلمان قتل کیے گئے۔

دشمن کو تو نہ ستائیں وہ تمہیں ستائیں کریں شکار دوسری قوم تمہاری جگہ لے آئے گا اور تم خدا کو کچھ ضرر نہیں پہونچا سکتے۔ [1]

انفروا خفافا وثقالا وجاهدوا بأموالكم وأنفسكم في سبيل الله

خدا کی راہ میں نکل کھڑے ہو چاہے حال میں ہو۔ عام اس سے بیزار و سلطان عصر ہو کا ہی تعلق سے بوجھل ہو رہے ہو۔ یا ہاں نفقات و علائق سے سبک رہے ہو ہر حال میں بسم اللہ پڑھ کر نکل کھڑے ہو۔

جان اور مال سے ہم اپنے جدا ہوتے ہیں ✤ آخ ہم دین محمد پہ فدا ہوتے ہیں

صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ۔

ہر ایک مقام پر دینی اشاعت اسلامی محفظ کو اسطرح تمام مخلصانہ و دلیرانہ جمع ہونا چاہیے۔ قل إن كان آباؤكم وأبناؤكم وإخوانكم وأزواجكم وعشيرتكم وأموال اقترفتموها وتجارة تخشون كسادها ومساكن ترضونها أحب إليكم من الله ورسوله وجهاد في سبيله فتربصوا حتى يأتي الله بأمره۔ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں سے فرما دیجئے کہ اگر تمہیں اپنے باپ دادے رشتہ دار و بھائی و بہنیں و کمائے ہوئے مال و تجارت جسکے مندا پڑ جانے سے رہنے ہوا اور مکانات جن میں رہنا پسند کرتے ہو تمہیں اللہ اور اسکے رسول اور دینی جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو ذرا صبر کرو یہاں تک خدا کچھ کرے یہ وہ تمہارے سامنے موجود کرے

حق بات یوں ہی کہہ اٹھا ہے جنہیں چشم بصیرت عطا کی ہے اور تعصب و ہٹ دھرمی میں مبتلا نہیں ہیں انہیں ان مکالمات حزینہ میں وہ اعتدال و مناسب کھلائی دیتا ہے کہ وہ کہہ اٹھتے ہیں جسطرح حصے زائد یا ناقہ کا اٹھانا ظلم و جفاکاری ہے اسی طرح اسکا ارادے سے بڑھ کر بند ہو جانا بیرحمی و مروت کی برائی ہے

حکومتی سکے ہر معاش کی عمران و بحر ✤ خاک پر رہتے ہیں یا دست گیر و تاجور

---

[1] القرآن الحکیم سورۂ توبہ ۳۸، ۳۹ [2] ایضاً ۱۲۰ [3] ایضاً ۱۲۱

اسلام صلح جو اس پسند اشخاص واقوام کے باب میں تو یہ ہدایت کرتا ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا[1] کہ جو تم سے صلح کرے تم بھی اُس سے صلح کرو۔ ع

گے کہ اُلفت کند با تو خاک پاپش باطل۔ اور امن دشمنوں کے متعلق میں ہیں ہدایت دلاتا ہے اور یہ مالک ہیں اخلاق بتاتا ہے کہ فرماتا ہے کہ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ[2] یعنی نسخ و نصرت من جانب اللہ ہے بہت ایسا ہوا ہے کہ تھوڑے لوگوں نے بڑی جماعت کو شکست دیدی ہے۔ اسکے متعلق میں کہاں تک لکھوں اور اس مرکے سلاطین اور سرزد و شان قوت کے مدارج کہاں تک بیان کروں ع

ملک چین کہ نشین تو ایسا رست ۔ چین ہمارا توڑ والاں مجھ دارد

ہے اخلاق ہو اور خدا کرے کہ اخلاق ہو جائے وہ شوکت انفال و شوکت تو یہ بہ تمام و کمال ہیچ نہ رہے کے ہو کر رہ جائے۔ اسے خوبی معلوم ہو جائیگا کہ یورپ کی جنگ کسطرح دنیا و دنیا کے اصول پر مبنی ہے اور اسلامی جنگ کیسی سراسر رحمت ہے صلح و خوشی کی آشتی کی یہ باتوں اور پھیلی ہوئی نیکیوں کو کاٹ کر کھاتی ہے اسلام جنی نوع انسان کی زیبائیل منصف ہیں وہ تمام شعاروں کے برعکس کرنے سے پھیلتی ہے۔

مسلمانوں کو ایک مدت ہوئی کہ تعلیمات اسلامی سے کہیں دور جا پڑے ہیں ایک حیوانی دلچسپی زندگی میں مصروف ہیں۔ انسانی زندگی اُن سے ایسی گم ہوئی ہے کہ اب پھر ملنے کی اُس کے کوئی اُمید نہیں رہی۔ الحاد و دہریت کی ہوا اُن میں تیزی سے چل رہی ہے۔ اور یورپ کی محبت میں بیہودگی و عیاشی جیسے باعث صلح ہستی ہے ہر اُن ایک درجہ خیتی کیطرف بڑھتے جا رہے ہیں ؎

تو بازیٔ شستہ و زہب مدہوست ۔ سیر و دو تیر چرخ پرتابی ؟

دوستو! اب شیار ہو جاؤ اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو۔ اسلام ایک امانت الٰہی ہے اور تم اُسکے امین۔ خدا نے تمہیں اس امانت کی قدر بخشے کو عقل دی ہے فہم و فراست

[1] سورہ انفال ۶۱ [2] سورہ بقرہ ۲۴۶ سے سورۃ آل عمران ۱۲۶ تک یہ تیرہ اس کی نظیر ہے مجھ دل میں جس قدر زیادہ ہے۔ کل جس بیمار کو تیرہ دن ہوئے ہیں آج وہ تو ہو واقعہ میں مصروف ہے جب اس گرفتار کرنے والے اسمان سے زمین پر اُتر رہے ہیں

عطا فرمائی ہے۔ پھر دین سے بے پروائی کی کیا وجہ ہے

چشم بازو گوش بازو ایں ذکا خیرہ ام در چشم بندی اے خدا[1]

اِس وقت تمام بلادِ اسلامیہ پر جو ستم و جفا کے بادل ٹوٹ پڑے ہیں، وہ صرف اِس علت میں کہ مسلمان لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کیوں کہتے ہیں۔ نہایت ہی حسرت و افسوس کی بات ہوگی۔ کہ جس جُرم میں دنیا ہمیں برباد ہی ہو۔ اُسکی لذت سے ہم نہ آشنا رہ جائیں۔ اور خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ کے مصداق ہوں۔

عزیزو! دین کو مضبوط ہاتھوں سے پکڑو۔ یہ دین اِسلام تمہارے پیغمبرِ رُومی فداہُ کا مہمان ہے۔ اُس اُمّتہ نوازِ پیغمبر کے مہمان کی عزت کرو۔ خدا تمہیں عزت دیگا۔ دین کے طفیل میں تمکن ہو کہ دنیا بھی بچ جائے۔ جیسا کہ ہمارے اگلوں کو ہو چکی ہے اور اگر دنیا بھی نہ تو کیا پروا رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نَبِیًّا۔

دوستو! آؤ ہم تم مل کر تعلیماتِ اسلامیہ کی اب قدر کریں اور اِس پر چلنے کی کوشش۔

السعی منی والاتمام من اللّٰہ

چھپا دستِ ہمت میں زورِ قضا ہے + مشکل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

اِس وقت بیشک تمام دنیائے اسلامی کے مسلمانوں کی حالت زار و نزار ہے۔ جو باتوں سے جو خلائے رُوحِ انسانی ہے وحشت ہو گئی ہے اور معاملات سے بے تعلقی۔ نہ اتفاق مسلمانوں میں ہے نہ اتحاد۔ نہ اِنکا کوئی مرکز ہے نہ اِنکا کوئی محافظانہ اصولِ تمدن پر انہیں کوئی چلانیوالا ہے نہ سیاست و حرب کیطرف کوئی رہبری کرنیوالا۔ اُس پر دشمنانِ الٰہی کا ہر چہار طرف سے نرغہ ہے

چو اخلاف دشمن ز موج طوفاں خیز + گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتہ است[2]

اِسلامی ہستی کچھ اِس طرح منتشر ہو گئی ہے کہ باہم ایک کا دوسرے سے کوئی علاقہ نہ رہا اور ایک مشت خاک مضمحل مسلمانوں کی جو اِس وقت عالم میں باقی ہے۔ حوادثاتِ دہر کے

---

[1] آنکھ کھول، زبان کھول اور اِس ذکاوت کے ہوتے ہوئے تیری بے توجہی اور لاپرواہی نے مجھے حیران کر دیا ہے [2] (مرزا اسد اللہ خان غالب) باد مخالف چل رہی ہے اندھیری رات اور طوفانی لہریں اُٹھ رہی ہیں کشتی (جہاز) کا لنگر ٹوٹ چکا ہے (جس کی وجہ سے

وہ اُٹھی دبا جاتی ہے شیر نر کو اور کبھی شیر نر اُٹھا لیتا ہے اس کو اور اسی طرح ہر جگہ کے عالم میں ہوتا ہے

جھوٹے انھیں بھی بے نام و نشان کیا چاہتے ہیں۔ آہ آہ۔

مبر[1] آے باد جائے بے نشان خاک مزار ما — جنوں را کار با باقی ست با مشت غبار ما

مسلمانو! بیدار ہو جاؤ کب تک ہم اپنے قدح کی خیر منائینگے۔

گراز نیستی دیگرے شد ہلاک[2] — مرا ہست بسیار از طوبیٰ و تاک

کب تک رکھینگے ہم نے اپنے دینی بھائیوں سے چشم پوشی کی۔ خدا کی رحمت ہم سے بیزار ہوگئی۔ دست و پا شکستہ ہو کر رہ گئے۔ اسی بے تعلقی نے سب دولتوں تک پہونچایا اور پھر کیسی ذلت جس سے وجود و ہستی کو فنائے نیستی میں بھی پہونچکر حجاب و ننگ ہی ہو۔

تجھے ایک دل ہی سے کام تھا نہ کہ اُستخوانوں کو چورہ کرنا۔

غرض مالک شیر کے واسطے تو نے نیستاں کو جلا دیا۔

بہر حال گذشتہ را صلوٰۃ و آیندہ را احتیاط۔ اُس حی و قیوم کی کتاب ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ کسی مسئلے میں ہم کسی مقتدا و لیڈر کے محتاج نہیں۔ قرآن مجید نے ہمیں سب کچھ بتلا دیا ہے جسقدر ہم غور و خوض اُسمیں کرتے جائینگے اُسیقدر ہمپر اُسکے انوار و برکات ظاہر ہوتے جائینگے۔

اگر ہر شامے صد بار خسارش بصد دیدہ — ہمی بینی شعوذ فانع کہ رخسارے دگر دارد

دین و دنیا کی ہدایت مع عزت و فراوانی ہے۔ اسطرف سے تو ہم بالکل بے نیاز ہیں۔ خدا کی کتاب پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اُن تمام امراض روحانی کا کافی بیان کرتی ہے جس سے رُوح انسانی مُردہ اور نفس امّارہ زندہ و قوی ہو جاتا ہے۔ پھر اُن امراض سے شفایابی کے نسخے بھی اُسی میں مندرج ہیں۔ یٰاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ لیکن مذہب کا بازو جو سیاست سے قوی کیا گیا تھا وہ بازو اب کٹ رہا ہے اور وہ بظاہر اسباب ایران افغانستان و ترکی حکومتیں ہیں۔ ایران و ترکی پر جو موت کہ لائی جارہی ہے اُس سے اگر مسلمانوں میں بیقراری و اضطرار پیدا ہو تو یہ موجب تعجب نہیں۔ اسلیے کہ اسلام نے جس ہمدردی و رافت و رحمت کا سبق کہ مسلمانوں کو پڑھایا ہے

---

[1] اے ہوا جائے مزار کی خاک کچھ بے نام و نشان جگہ پر نہ لے جا کیونکہ اس جنون کو ابھی بھی مشت غبار سے بہت سے کام لینا باقی ہیں۔ [2] سعدی شیرازی گلستان باب۔ اگر دوسرا (تیرنے کے اسباب) نہ ہونے کی وجہ سے ہلاک ہوا ہے پاس تو لوط ہے (تیرنے والا جانور، اس کو

وہ اسکے تکلیف سے محو ہو نہیں سکتا۔ گئے اور بھی کی تکلیف سے بھی انکا دل بلبلا اُٹھتا ہے۔ جبہ جانیکہ انسان اور پھر انسانوں میں اُسکے دینی بھائی۔ جنکے باب میں حدیث یوں ارشاد فرمائے۔ مثل المؤمنین کرجل واحد اذا اشتکی عینہ اشتکی کلہ واذا اشتکی راسہ اشتکی کلہ۔ تمام مؤمنین کی مثال ایک شخص واحد جیسی ہے جبکہ اسکی آنکھ دکھتی ہو تو تمام جسم درد مند ہو جاتا ہے اور جب سر میں درد اُٹھتا ہے تو سارا بدن آزار مند ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں کے کانوں میں یہ صدا پہونچتی ہے کہ ایران میں اُن کے بھائی روسیوں کے ہیر حم خنجر سے شہید ہوئے تو وہ اپنے بستر و نیر تر پ جاتے ہیں۔ جب یہ خبر ملتی ہے کہ مرووں کے خون سے طرابلس کی زمین لالہ زار بنگئی تو اُنکے قلوب سینے میں خون ہو کر بہنے لگتے ہیں۔ اسلئے کہ مسلمانوں کے آزاد کا مجموعہ بمنزلہ شخص واحد کے ہے گو اجسام متعدد ہیں مگر روح سب میں ایک ہی ہے اور یہ وہی روح ہے جسے آج سے تیرہ سو برس پیشتر نبی اُمّی روحی فداہ نے مکے کے ریگستانوں اور طیبہ کے وادیوں میں پھونک کر قوٹولوا۔ لا الٰہ الا اللہ کہہ کر پھونکی تھی۔ صلے اللہ علیہ وعلے آلہ واصحابہ واولیائے امتہ۔ گرچہ دورِ اسلامی ہمارے شامتِ اعمال کی بدولت نیم جاں ہو کر پژمردہ و افسردہ ہو گئی ہے لیکن پھر بھی آخری سانس باقی ہے اسی سے اُمید ہے کہ شاید کسی دلسوز کا نعرۂ اللہ اکبر پھر ان نام نہاد زندوں میں یک حیاتِ ایمانی پیدا کر دے۔ اور ایک زندہ کر دیوں مسلمانوں کو اس بیحیا موت سے نجات دلا کر اسلامی زندگی کے لطف سے آشنا کر دے۔ ؎

اے باد شبِ خوباں دارو غم تنہائی ۔۔۔ دل بے تو بجاں آمد وقت ست کہ بازآئی[1]

بہر حال جب تک رمقِ حیات باقی ہے۔ احساس بھی ضروری ہے۔ اور یہ اُسی احساس کا نتیجہ ہے کہ جب ایک جگہ مسلمانوں پر ظلم و ستم ہوگا تو دوسری جگہ کے مسلمان یقیناً مضطرب و بیقرار ہو جائینگے جب کوئی اسلامی حکومت نہ ہوگی تو بیشک مسلمانوں کو چین و آرام نصیب ہو جائیگا۔ ہاں یہ فرق البتہ ضرور ہے کہ بعض جگہوں سے بہ نسبت زیادہ قوی اور تعلقات زائد گہرے ہیں جس طرح جسم میں بعض اجزا کو بعض پر فضیلت حاصل ہے اسیطرح دولِ اسلامیہ میں ایک کو

[1] (خواجہ حافظ شیرازی) اے حسینوں کے بادشاہ تنہائی کے غم سے فریاد ہے۔ تیرے بغیر دل بیجان سے عاجز آگیا ہے وقت ہے کہ تو لوٹ آئے۔

دوسرے پر افضلیت ہے۔ اسی لحاظ سے مسلمانوں کا تعلق جو سلطنت ترکی سے ہے وہ زائد بیکل و مضطر کرنیوالا ہے۔ اس سلطنت کی مثال سر کی مثل ہے اور دیگر دول اسلامیہ مثل دیگر اعضا و جوارح کے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں اور وہ زندہ رہے۔ اسیطرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کے دونوں پاؤں قطع ہو جائیں اور وہ حیات کے ایام پورے بسر کر دے۔ لیکن یہ کسیطرح ممکن نہیں کہ ایک سر بریدہ ایک لمحے کے لیے بھی زندہ کہا جا سکے یا رہ سکے۔ لہذا اب باب ظاہر سلطنت ترکی کا زوال اسلامی محافظ کا زوال نیابت الٰہی کا دنیا سے فنا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ گو قدرت خداوندی سے یہ امر مستبعد نہیں کہ وہ انکو شاکر کسی اور کے ہاتھ میں اسلامی شمشیر کا قبضہ عطا فرمائے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ لیکن جب تک ان کے ہاتھوں میں لوائے احمدی ہم دیکھتے ہیں ہمارا دل بیساختہ اُسطرف کھچ جاتا ہے اور اسلامی غیرت کشاں کشاں اُس جھنڈے کے نیچے مسلمانوں کو لا دے دے قدمے سخنے غرض کسی نہ کسی طرح لے ہی آتی ہے ؎

تا زمیخانۂ و مے نام و نشاں خواہد بود　　سر ما خاک رہ پیر مغاں خواہد بود[1]

اگر مسلمانوں کی قلبی کشش اس سلطنت کی جانب نہ ہوتو یہ باعث تعجب و مقام تحسر ہوگا ہم دیکھتے ہیں کہ ایام جاہلیت میں متولی خانۂ کعبہ تمام قبائل عرب کا مخدوم و مطاع تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور اُس کی یہ تنظیم محض اُن خدمات جلیلہ کے سبب ہوتی تھی جسے وہ انجام دیا کرتا تھا اور وہ چھ خدمتیں تھیں۔ (۱) سقایہ۔ حجاج کو پانی پلانا۔ (۲) رفادہ۔ ایام حج میں حجاج کو کھانا کھلانا۔ (۳) حجابہ۔ خانۂ کعبہ کی کلید برداری۔ (۴) لوا۔ جنگ کے وقت جھنڈا اُٹھانا۔ (۵) قیادہ۔ لڑائی میں سپہ سالار ہونا۔ (۶) صدارۃ دار الندوۃ۔ اب اسوقت بجز ایک خدمت یعنی حجابہ بقیہ خدمتیں سلطان روم کی ذات سے قائم ہیں۔ نیز وہی محافظ ہے حرمین شریفین کا۔ وہی جاروب کش ہے بخف اشرف کا۔ وہی خدمت گذار ہے بغداد شریف و بیت المقدس کا۔ پھر یہ کیسے ستم کی بات ہوگی اگر مسلمان اُس امر کا لحاظ نکریں جسکا لحاظ

[1] (خواجہ حافظ شیرازیؒ) جب تک شراب خانہ اور شراب کا نام باقی رہے گا ہمارا سر پیر مغاں کے راستہ کی خاک بنا رہے گا۔ [2] القرآن الحکیم، سورۃ فاطر، ۱۷

مشرکین تک کرتے تھے مشروطیت سلطانی میں ان سعادت سقہ سے کام نہ لیں اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ہم سلطان کی ملت کریں اور اسکی خدمتگذاری کو سعادت سمجھیں۔ اسلئے کہ ہر وقت کہ اسوقت سلطان انعام دے رہے ہیں، ہمیشہ نظر اس سے کہ تمام مسلمانوں کو کمر باندھ کر ہمراہ کر رہے ہیں۔ نفس الامر میں وہ خدمتیں نہایت ہی مشکور و محترم ہیں۔ اس خدمت کی ہوس میں صرف استقدر کمی ہوگا کہ کسی کی تنبیہ یا موقت کہ ہر ہم خیال شدہ تبصری یا بسیط اسے فرزند اسمٰعیل کے رکھی۔ اور اسے ناکردہ یار۔ بات عمر نے اگلی عرف کو سمجھا ظاہر کیا۔ لیکن اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ اسے ہر ہیرو اسمٰعیل (علیہ السلام) کو ہمیشہ کمر کو خدمت کرنے والوں اور مشکت رہنے والوں اور کمر باندھ کر خدمتوں کیلئے مستعد رکھنے کی آج یہ سعادت جلیلہ سلطان کے ہاتھوں انجام پا رہی ہے۔ اللہ اللہ یہ وہ ہاتھ ہے جسکے لئے ایسے ایسے جلیل الشان انبیاء علیہم السلام اسور ہوئے ہیں وہ ہاتھ ہے جس کی آبادی دنیا کی رونق، دنیا کی سرسبزی اور دنیا کی ہلاکت، تباہی کی علت ہے۔ یہ وہ ہاتھ ہے بیت اللہ و بیت الحرام کا نصب العین ہے۔ پھر یہ کہہ کر ہو سکتا ہے کہ وہ سنہ سلطان تو اتنی دنیا اور خدا کے نافرمانی کی تحریر میں ہر تک شمشیر و رہ ہیں۔ ہمیشوں کے کہ اب کسی سوگند کسی جگہ کو پسند کرتے ہیں تو پہلے سے تباہی ہے یا عمل کی جگہ تحریر ہوتی ہے اسکے بعد اگر ہیں اجیان و دولت کی تحمیل متعرکہ آرائی ہیں۔ اسمیں جس آس جگہ سے نفس و حرکت منتظم ہے ترقی سے پہلے شاہی ہیں اکثر ہی اور اسکے بعد جگہ اشخاص کے قلیلے و دوزخ میں خالی ہو کر پھر بیشمار دوزخی انسان ہو جاتی ہے۔ پس ہم نصب اس مقام میں ہو کر سکتا ہوں کہ سب دنیا کو فرزند آدم سے تاور کرنا مقصود ہو تو سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر ہوئی کیسے ہوئی اسکا کرنا بنانے والا ابراہیم خلیل اللہ سے بیشتر نہیں چلتا۔ علاوہ تعمیر ابراہیمی تیسری تعمیر ہے۔ اب جبکہ کعبہ ہی تعمیر نصب ہو چکا تو انسانوں کی آفرینش ہوئی پھر انہیں میں تمدن قبائل و حکومات کی تحریر شروع ہوئی۔

ف۲ سلطان اسلام اور سلطنت اسلام کی خدمت و عبادت کی اہمیت کا اس سے اندازہ کر لینا چاہئے سلطنت ترکی بھاری دینی بھائی۔ اس پر اسلامی سلطنت میں اسلام کی قوت و ترقی پھر عرب میں شریفوں کی حکومت و خلافت پس اُن کی عبادت اور خدمت اور تمام مسلمانان ہند کو تمام مسلمانان عالم پر

اب اگر یہ چاہتے ہو کہ دنیا اسے ملتا رہے تو خدا کے گھر کی عظمت قائم رکھو۔ وہ عبادت
اسی پر مبنی ہے اسی دن دنیا کی عظمت اٹھ جائیگی۔ جب خدا کا حرم، رسول کا حرم، مسلمان
محفوظ نہ رہے گا تو پھر اس روز اس عالم کی بستیاں بکھیر دی جائینگی آسمان پاش پاش ہو گا اور
زمین ریزہ ریزہ ہو کر آب ہو گا خدا جناب نہ رہیں گے۔ ہذا سلوک دن عید اور
رات شب برات ہو گی۔ یہ کہ تبکان الارض ثم الارض والسموٰت وبرزوا
للہ الواحد القہار۔ تو اگر کوئی یہ خیال کرے کہ خدا کا وہ گھر جس سے بقائے دنیا وابستہ ہے
ہمیشہ سے اسی طرح اسلام کے قبضہ میں رہا ہے۔ وہ اس میں کعبۃ اللہ کی بے حرمتی کرے گا مسلمان اسکے ہاتھ سے کیونکر
اور کیسے نکل سکتے ہیں ہم ہی ہیں جو صدیوں سے مسلمانوں کی سستی کی سزا میں کفار کے ہاتھ میں پڑے ہوئے ہیں
اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ ہم کو کسی طاقت نے غلام بنایا ہو۔ اسلئے کہ حقیقی حریت اسلام میں پائی جاتی ہے
اور ہر وہ عادات و اخلاق میں خود داری، یکسو، مستقل مزاج، ہمت اور استقلال ہو گا کہ ہم اس میں سے جو
ہیں کہ مسلمانوں کے قبضہ میں چلی آئی ہو۔ اور اسکے اصلی باشندے ہی رہے ہوں۔ اب کفار کے
قبضہ کے قبضہ میں چلی جائے۔ مسلمانو! حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ علیہ السلام اسمٰعیل علیہ السلام
اپنے بیٹے اور حضرت ہاجرہ اپنی بیوی کو کہ سنسان میں جگہ جب الحمد للہ آباد ہو گئے اسوقت یہ بیت اللہ
بالکل ہی ویران اور سنسان تھا۔ وہ جگہ جہاں کہ بیت اللہ تعمیر ہوا ایک بلند ٹوہ کی صورت میں تھا۔
جسکے چاروں طرف کچا و نشیب تھا۔ جنوب مغرب کا قافلہ اسطرف سے گذرا۔ پانی دیکھکر قافلہ کا کارواں
ہوا۔ حضرت ہاجرہ سے اجازت لینے کے بعد یہ قافلہ وہاں سکونت پذیر ہوا۔ کچھ دنوں بعد حضرت
ابراہیم تعمیر کعبہ کیلئے حرم سے تشریف لائے اور حضرت اسمٰعیل بھی عمر اسوقت تیس برس کی تھی
اپنے باپ کیساتھ مکر تعمیر کعبہ میں مشغول ہوئے۔ اور نہایت اخلاص و کمال عبودیت کیساتھ
اس حکم الٰہی کی تعمیل فرماتے اور دعا کرتے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم[1]
خانہ کعبہ بکثرت تیار ہوا۔ اسکی خدمت حضرت اسمٰعیل کے متعلق رہی۔ ان کے بعد ان کی
اولادوں اور ذریت میں یہ خدمت جاری رہی۔ یہاں تک کہ قصی ابن کلاب جو پانچویں

[1] القرآن الحکیم سورۃ ابراہیم ۳۸ تک ہمارے رب ہم سے قبول فرما بیشک تو ہی سنتا جانتا ہے
والا ہے (سورہ بقرۃ ۱۲۷)

پشت میں اجداد رسول اللہ صلعم کے ہیں اس خدمت سے مستفیض ہوئے۔ اسکے بعد برابر یہ خدمت خاندان قریش میں چلی آئی۔ جب خلافت عباسیہ کا دور ختم ہو گیا اور برائے نام بھی انکی خلافت باقی نہ رہی۔ اور مصر کو سلطان محمد سلیم ثانی نے پھر ترکی کے غلام بنا تو نے رہائی دی اسوقت سے اسوقت تک یہ خدمت خاندان آل عثمان میں چلی آتی ہے۔ محافظت حرمین شریفین اور نیز انکی حکمت و درایت کا مرہت کرنا تمام مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ اسوقت سلطان روم ان تمام مصارف کو برداشت کرتے ہیں اور مسلمانوں کو اس فرض کفایہ سے سلطان کے اس حاصل احسان نے سبکدوش کر دیا ہے۔

حرمین شریفین کا انتظام ان مقامات کی تحسین و تزئین بیت اللہ و بیت الرسول کے قنادیل کا روشن کرنا۔ ائمہ و موذنین و مفتیان دین متین کی خدمت مقام سیاسی و انتظامی کا تقرر بجملہ سب خزانہ سلطانی سے ادا ہوتا ہے۔ ہر سال ایک جدید غلاف سے خانہ کعبہ کو مزین کرنا سلطنت ترکی ہی کے ذمہ ہے ہم غلاف خانہ کعبہ ایک قدیم الایام سے جاری ہے۔ اسکو آنحضرت نے بھی جاری رکھا۔ پھر خلفائے اربعہؓ نے بھی اس سنت رسول کو زندہ و قائم رکھا۔ اور الحمد للہ کہ اسوقت تک تو یہ سنت جاری ہے۔ والغیب عند اللہ۔

کیا یہ امر قابل لحاظ نہیں کہ بیت اللہ جو مسلمانوں کا مرکز ہوا اسکی تزئین جاتی رہے اور ہمارے سکانات عمدہ ساز و سامان سے آراستہ ہوں۔ کیا یہ ڈوب مرنکی بات نہیں کہ روضہ رسول اللہ و خانہ کعبہ میں قنادیل روشن ہوں اور ہمارے گھروں میں بتی کی روشنیاں و موی بتیاں جگمگا رہی ہوں۔ افسوس ہم اپنے فرائض سے ایسے غافل رہے کہ اسوقت اس خدمت کی اہمیت تک ہمارے قلوب سے محو ہو گئی۔ کاش ایک سالانہ رقم مسلمانوں سے ہر گروہ سے خدمت سلطان میں ان امور متبرکہ مقدسہ کیلئے پہونچا کرتی۔ تو آج ہم میں یہ جمود نہ ہوتا۔

حضرت نعیم داری جو صحابی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں ملک شام سے جب واپس تشریف لائے تو چند قندیلیں اپنے ساتھ مسجد نبوی کیلئے لیتے آئے۔ مدینہ طیبہ پہونچکر مسجد نبوی میں لگوا دیں اور کہ روشن کی۔ جب آنحضرت تشریف لائے اور مسجد کو قندیلوں کی روشنی سے

لے مصر میں دولت چرکسیہ کا خاتمہ ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء۔ یہ دور دراصل سلطان محمد سلیم اول کا تھا، یہاں سلطان محمد سلیم ثانی (۱۵۶۶ء تا ۱۵۷۴ء) بن سلطان سلیمان اعظم کا نام سہواً منسوب ہوا ہے۔ تاہم سلیم ثانی نے ۱۵۷۰ء میں یکرو روم کے جزیرہ قبرص پر چڑھائی کی اور اس جزیرہ کو

عیسائیوں کے ہاتھوں سے چھین لیا، اس واقعہ پر یورپ کی سلطنتیں بہت مشتعل ہوئیں۔

تابانی و درخشانی دیکھی تو بہت ہی خوش ہو کر تبسم فرما ہوئے فرمایا۔ نورت المسجد نفعنا اللہ علینک تو نے میری مسجد روشن کی۔ اللہ تیری آنکھ کو روشن فرمائے۔ اس سے خیال کرو اس شخص کی نیت کیا ہوگی جو مسجد نبوی روضۂ مقدسہ۔ کعبہ مسجد بیت الحرام۔ ان تمام اماکن مقدسہ و مطہرہ کو روشنی سے ہر روز منور کرتا ہے۔

آج ہی جارے بخش آستانہ مصطفوی نور و ضیاء مشعل مسجد نبوی تباہ و برباد ہو رہا ہے اور ہم دنیائے سکوت و اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ گویا اسکا کوئی اثر مرکزی مقام پر مسلمانوں کے نہیں ہو پہنچا۔ یا ایسے مقامات مطہرہ پر ہمارا جس الناس کا تصرف مسلمانوں پر لیک سخت ہو لنگ باز پرس الٰہی عائد نہیں کرتا۔

ہائے افسوس اللہ کا حرم رسول کا حرم نجدی قدم کا گلدستہ گاہ ہو۔ اور ہم زندہ رہ جائیں۔ عزیزہ اللہ علیہ وہ جگہ ہے جہاں امام مالک کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر نہ نکلے۔ ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ جس زمین پر اللہ کے محبوب کا قدم پڑا ہو اس جگہ کو گھوڑے کے سموں سے روندنا میرے لئے موجب شرم و حیا ہے۔ آج اس ارض مقدس کا تحفظ فنا کیا جا رہا ہے۔ ہر چہار سمت سے دشمنوں کا نرغہ ہے۔ اور ایک ضعیف و ناتواں جسم سب کے مقابلے میں سینہ سپر ہے۔ ۱۳۴۵ھ امیر اسلام کے ہیں متنفس اعداء۔ لاکھوں ہیں مگر خادم حرمین ہیں تنہا۔ واحسرتا دو ہزار سے بڑھکر تحشر و تناصف تو اس مرکز کا کہ کوئی دوسری طاقت اسکے قائم مقام ہو ہمیں دکھلائی نہیں دیتی۔ اس پیشتر یہی مرتبین ان ایسا بخس قصد کیا جا کر اسوقت قوت قاہرہ اسلام کی مضبوط تھی۔ اور شیشہ اسلامی پر بال مسلمانوں کو حیرت تھی۔ اہل یمان میں سمیت اپنی ہمایوں فرمان کر دیں۔ اور اٹھے ہوئے قدم کو نیست و نابود کر دیا۔ بعد اسلام و دست مرتبین شریفین پر ہوئے۔ پہلا یزید بن معین و دوسرا احمد بن عبد الوہاب نجدی علیہ ما علیہ جسکو امیر کے فرزند نے بحکم سلطان محمد سلیم ثالث باسمن وجوہ انجام دیا۔ اب تو صرف طاقت ہی نہ تو کونین قوت۔ نہ معلوم کیا ہونا ہے اور کب کیسے مصائب سے مسلمان دوچار ہونا پڑیگا۔ اسلام کی قوت دفاعی کا ہٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ کان کھول کر سن لو۔ کہ سر گرام عرض ہم آہستہ و بر باد ہو یہ بات رہے یاد ہو۔ مکہ پھر مدینہ پھر بغداد نہ بصرہ۔ واحسرتا دردا سلطنت ترکی کا زوال صرف اسی حیثیت سے خون نہیں اٹھا کہ ایک اسلامی بادشاہت غلامی سے مبتدل ہو رہی ہے۔ بلکہ اسلام کا محافظ سیاسی کتاب اللہ کا نگہبان و نماہی جوامیں دنیا میں قائم کیا گیا تھا

لہ یہ دونوں حملے بقسمتی سے ان لوگوں کی طرف سے سرزد ہوئے جو بظاہر کلمہ گو، مسلمان اور دعوٰی مسلمانی کا بھی کرتے تھے۔ یزید پلید کے حکام لشکر نے کربلا و شام تو اظہر من الشمس ہیں لیکن یزید کی شامی فوجوں کے ہاتھوں حرمین شریفین کی بے حرمتی، صحابۂ و صحابیات رضی اللہ عنہم و صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایذا رسانی مشہور تاریخی واقعات ہیں۔ (مرتب)

آج وہ وقت آیا ہے۔ اس میں ان کی جو رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پلا تھا کوئی محافظ نہ رہا۔ افسوس کہ اسلام ہے بے ستون و یاور۔ کوئی نہیں سر پر۔ خالد نہیں جعفر نہیں عباس نہیں حمزہ۔ واحسرتا و دردا آہ۔ وہ حوادثانہ دیکھیانہ جاسکیری جہانبانی کا شمع جو تیرہ و سو برس سونے مختلف انجمنوں کو روشن کرتا رہا اب چراغ سحری ہے بھی زائد و مضمحل ہو گیا۔ وہ چراغ تھا جو کبھی ایشیا میں روشن محفل تھا اور کبھی بغداد میں زینت مجلس۔ کبھی اسکی شعاع مصر میں تھی اور کبھی فلسطین میں۔ ایشیا میں کسے لمعات درخشاں تھے اور یورپ میں اسکے انوار تابناں۔ افسوس کہ اس چودھویں صدی الحاد و تثلیث کے جھونکے اُسے گل کیے دیتے ہیں خداوندا تیری پناہ تیری پناہ اسپر ہماری یہ بے بسی ایک عجیب عبرتناک سماں ہے۔ ہمارے قلوب کا سنج ہو جانا چشم حقیقت بیں کے خون رولا دیتا ہے۔ اس مصیبت کو دیکھو پھر ہماری غفلت پر نظر ڈالو۔ گھر لٹ گیا خانہ برباد ہو گیا۔ مرکزی مقام تزلزل میں آ گیا۔ مگر نہ ہمارے قلوب اس سے متاثر ہوئے نہ ہمارے حرکات و سکنات قابل پر اسکا کچھ نیک اثر پڑا۔ آج سے پہلے ہم جن بتا کن افعال و اعمال میں مبتلا تھے آج بھی انھیں کردار و تگ و پو میں لے رہے ہیں۔ ہم میں کوئی خیال اسکا پیدا نہیں ہوا کہ خادم حرمین جب اسطرح ضعیف بلکہ خانہ کے قریب پہنچا تو اب اسکی محافظت کا کیا انتظام ہونا چاہیے۔ ترکوں کی شکست بجائے اسکے کسی ہمدردی پر ہمیں آمادہ کرتی۔ ہم میں غیرت دینی و حمیت اسلامی پیدا ہوتی اور بھی سستی تکاہلی و عدم مبالات کا سبب ہو گئی۔ خانجا بالاثر و موثر طبقوں نے یہ مسئلہ طے کر لیا گیا کہ خلافت کا مصداق سلطنت ترکی ہو نہیں سکتی پس مسلمانوں کو کوئی حق اسکا دے نہیں۔ نیز اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ ترکو نہیں بیدینی بدرجہ کمال ہے۔ لہذا انے چشم پوشی ضرور ہے۔ ایک اور جماعت وقعت و حشمت ہندوستانیوں کی تعلیم یافتوں کی ہے۔ اس جماعت کا جو حصہ جو یورپ کا اقتدار دیکھ کر مبہوت ہو گیا ہے بالکل بے بہرہ ہے۔ اسلئے ان کے ترکو نے نظر الفات پھیر لینے کے دو سرے وجوہ قرار دیے اوّلاً انکا علوم و فنون جدیدہ سے ناواقف ہونا۔ ثانیاً ترکو نہیں علم قابلیت تمدنی و سیاسی۔ پھر ایسی سلطنت جو یورپ کے مفید علوم سے بے بہرہ ہو اور انہیں سلطنت کرنیکی ویسی قابلیت نہ ہو جیسا کہ دل یورپ میں ہے اسکی مستحق ہے کہ فنا کر دی جائے اور اسکی جگہ میں ایک متمدن قوم حکمرانی کے لیے جانشین ہو۔

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔ ۲

---

۱ خبط بالا یا مبالات۔ خوف کھانا، اندیشہ کرنا۔ ۲ ہم اپنے نفوس کے شر سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں۔

خلافت

ہم اوّلاً نہایت اختصار کے ساتھ مسئلہ خلافت سے بحث کرتے ہیں تاکہ ناظرین پر یہ امر تمام ہو جائے کہ اس طرح کی باتیں تقدس و اتقا کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ تن آسانی و لذاتِ دنیاوی اِن کلمات کی محرک ہیں حقیقت یوں ہے کہ خلافت اپنے حقیقی معنوں میں تو خلفائے اربعہ تک قائم رہی۔ اُسکے بعد سلطنت و بادشاہت تھی حقیقی خلافت کی جھلک بعد خلفائے راشدین عمر بن عبدالعزیز[1] کے زمانے میں پائی گئی۔ پھر تو اسکی تخلیہ بالکل ہی مفقود ہو گئی لیکن پھر بھی مسلمانوں کا بادشاہ خلیفۃ المسلمین و امیر المومنین کہا ہی جاتا تھا۔ بنو اُمیہ و عباسیہ کی سلطنت کا مطالعہ کرو اور ایک نظر خلفائے اربعہ کے عہد کی طرف ڈالو۔ تو تمھیں صاف فرق خلافت و سلطنت میں معلوم ہو جائیگا۔ لیکن چونکہ یہ سلطنتیں اسلامی تھیں اور مقاماتِ مقدسہ کی محافظ اور اسلام کی قوتِ دفاعی اِن ہی سے قائم تھی۔ اِس لیے عامۂ مسلمین یہاں تک کہ علمائے ربانی بھی اُنھیں خلیفہ ہی کہتے رہے۔

خلافت کی جو تعریف کہ شریعت نے کی ہے اُسکے الفاظ یہ ہیں۔ الخلافۃ ھی النیابۃ عن النبی صلے اللہ علیہ والہ وسلم فی حراسۃ الدین وسیاسۃ الدنیا فھی جامعۃ للریاستین کما ان الدین الاسلامی جامع لمصالح المعاش والمعاد وبنیٰ علیٰ اساسی لسلطنتین الزمنیۃ والروحیۃ۔ یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت کا نام خلافت ہے دین کو محفوظ رکھنا اور سیاستِ دنیا کو قائم رکھنا خلیفہ کا فرض منصبی ہے پس خلافت دین و دنیا دونوں ریاستوں کو اُسیطرح جمع کرنے والی ہے جیساکہ اِن دونوں کا دین اسلامی جامع ہے۔ اِسمیں کوئی شبہ نہیں کہ خلفائے اربعہ کا زمانہ نہایت ہی خیر و برکت کی حاسیت کا زمانہ تھا۔ اور ان میں سے ہر خلیفہ کی ذات ایک کامل نمونہ تعلیماتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی۔

---

[1] عمر بن عبدالعزیز (صفر ۹۹ھ/۱۳ ستمبر ۷۱۷ء - رجب ۱۰۱ھ/۱۶ جنوری ۷۲۰ء)

ڈبان جائے اُس تعلیم پر اور نظر ہو جائے اُس شخص پر جس نے مرکے ہمشیں اور
بادیشینوں کو اُس سے بے کار کیا یا جس پر خلافتوں اور سلطنتوں کی بنیاد تھی۔
ابن جانشینوں کے عہد میں مسلمانوں کی دینی و دنیاوی مصالح و خارجہ سب غلبہ کی ذات
سے وابستہ تھی۔ اور انھیں کسی دوسری طرف التفات کی ہمت نہ تھی۔ جب اسکی یہ
زمانہ گذر گیا اور جو ہمیشہ کا دور شروع ہوا کہ حکومت و انتخاب نا کر دیا گیا مسلمانوں کے
مطالب کی سمتیں بدل گئیں۔ مسائل غلبہ کے بجائے میں لیا گئے۔ اور مسائل
اہل بیت کے آستانوں پر جا کر رکے۔ اب جبکہ بارگاہ خلافت عرب سے بالکل ہی
منقطع ہو چکی ہے۔ جس سے دین کی پرورش ہوتی تھی اور مذہب کی تعلیم جس پر منحصر ہے جیسے
عہد کا وہ کان سا عہد جاہلیت پر قدامت غریب نہ مانگی ہے۔ طریقت کی تعلیم بھی علماء و
صوفیہ کے ہے میں آچکی ہے۔ مگر پھر بھی خلافت کا مطلب اُس سے سلب نہیں ہوا۔ جہاں تک
آہنگ جو اُس تعلیم کے ساتھ خلفاء کا سوز طلب کرتا ہی ہوا ہے۔ بالخاصہ بجز یہ کہ
خلفاء اور عرب سنت میں ملک قائم ہو گئیں۔ ملک نہ رہا۔ سلاطین کی تھی۔ اُنھوں
نے اس تشریع الٰہی کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاص اپنی
امت کے لیے بتا گئے تھے اپنی امت میں اشاعت چاہتے تھے۔ وہ سرے اللہ ایسی بیت
جنکی باصفا روشنی میں ڈوبی ہوئی زندگی اُن مشکوٰۃ و مشکیٰ و تفسیر باقی و تفسیر
رطب الجنات العلیین کا مخلصانہ درس سب تحری کو دیکھ کے تلوکم تھی و مسور کرتی۔

تیسری جماعت علماء کی تھی۔ جنھوں نے من جملہ علوم کتاب اللہ و حدیث رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درس شروع کر دیا۔ قرآن و حدیث سے احکام کو مستنبط کرتے۔ مسائل کا استخراج کرتے
اور عبارات و اشارات کو تحقیق کرتے۔ مسلمانوں میں جا جا تھیں مکاتب قائم ہوئے جہاں بچے کے ابتدائی
ہونے لگیں۔ لیکن خلیفہ وقت کی جانب سے ہاں دینی امور کے لیے تشریع تھی۔

علماء اور صوفیہ کا طبقہ کہیں اس خلافت کے مخالف نہ ہوا۔ بلکہ جو خلفاء سے آمادہ پیکار ہوئے

اُن خلفاء کا بھی ہمیشہ خلوص دعائے الٰہی سے شامل رہا کہ یہ اللہ خدمت کے سوا اور
کچھ نہ تھا۔ تمام خلفاء نے اشتراک کے ساتھ تحقیق کو حکومت کو واشگاف بنایا۔ اُسے خاندان مروانیہ
نے اختیار کیا کہ کہ تک ہیر معاویہ نے کہا ہے جب تک اُن کے ہاتھ شریع ہے ہم اپنا دامن

آسے دربار شریعت سے باغی کا خطاب ملتا تھا۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ جبکہ خلافت کا کام تین جماعتوں میں منقسم ہو گیا تو پھر سلاطین کو خلیفہ کہنے کی وجہ کیا؟ اگر نیابت کے ایک بڑی تعمیل ہی خلیفہ کے مفہوم کو ادا کرتی تھی تو پھر صوفیہ و علماء کو بھی خلیفہ کہنا چاہیئے تھا۔ لیکن ایسا ہونا ہی کسی قوت کا باعث نہ ہوتا تھا۔

[1] یہ کہ سب خلفاء میں جامعیت نہ تھی۔ اور دین و دنیا دونوں کو وہ سنبھال نہ سکے۔ تو ان سے دین کو علماء کے ہاتھ میں دے دیا بصورت مختلف صیغہ مختلف اشخاص کی نگرانی میں دیا جانا ہے۔ اسلئے دین کی اس بٹ سائل شعبہ عراست علماء کے سپرد کر دی گئی۔ اور اسطرح سلطنت کے دو حلوں کا مشکل اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا نے پر کر دیا۔ گو اس میں کبھی کبھی باہمی کشاکش بھی ہو جایا کرتی ہو کا نتیجہ حسرت انگیز ہوتا۔ مگر پھر بھی ان علماء سلطان سے جنکی سند کی صدق وصفا سے معمور تھی۔ ہمیشہ اپنے قلم سے شیشۂ اسلامی کی نگہداشت کی۔ اور ہمیشہ قوۃ و فاعلہ کو خلیفہ کہتے رہے۔ اس کی مصلحت یہ تھی کہ سلطانی طرف سلطانوں کی توجہ اور ان کے دل کا مکاؤ صرف اسی حیثیت سے ہو کہ ہم اسکی رعایا ہیں۔ اسطلاح ہم پر اسکی اطاعت اور اسکے ملک میں امن رکھنا واجب آتا ہے۔ نہیں بلکہ یہ خیال ہونا چاہیئے کہ سلطان اسلام کی وہ قوۃ و طاقت ہے جس سے دین کی حفاظت ہے اسلام کا بچاؤ ہے۔ تاکہ سلطان اس حال میں جبکہ اسکی رعایا بھی یہی خیال انہیں عادم حرمین سے وابستہ رکھے اور علماء کی امداد و معاونت پر مجبور کرے۔ اور بصورت رعایا ہونے کے ان کی دلسوزی و محبت اور بھی زیادہ ہو جائے اور اسطرح بقائے سلطنت اسلامی سے ہر طرح کا فائدہ اخروی دینی و دنیاوی سلطان حاصل کر سکیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ جس ملک میں اپنی سلطنت ہو اور اسکے ساتھ ہی دشمنوں کے حملے سے امن ہو۔ اپنے میں قوۃ و طاقت جہانداری کی ہو۔ تو پھر علم و فضل سے وہ ملک آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔

---

[1] تو اُس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں (سورہ فاطر، ۲۸)

جرمن وفرانس وانگلینڈ جو جو علوم وفنون زمانے میں ترقی کر رہے ہیں اسکی تیاری اپنی سلطنت کا وجود ہی۔ خود سلطان ایام خلیفہ میں جبکہ دربار و اسمبلی کو فتح کر رہے تھے ذائے ساتھ ہی ساتھ ان کے اقوام علوم وفنون کو فتح کرتے جاتے تھے۔ بیلار علوم فنی کے عہد سلطنت میں ایجاد ہوئے۔ کتنے نئے فنون میں ہم یوں سے فنان ڈالی۔ ڈور کیوں جائے۔ ہندوستان ہی کو لیجئے اور اسکے اس حصہ پر نظر ڈالئے جہاں سلطنت باقی ہے مگر اسکا اوج جو زوال پذیر ہے صرف اوسکے وجود نے ایسے ایسے علماء وگلہ پیدا کئے کہ آج ان کے کلام کا کچھ حاصل اہل کے لیے موجب افتخار ہے۔ مگر افسوس جبکہ علوم مغربی نے اپنا سکہ جمایا اور اپنی سلطنت علوم اسلامیہ کی حمایت کیلئے باقی نہ رہی تو پھر کیا جاہلت وبیعلمی کی ہوئی۔ قرون وجود تو دیدہ ہندوستان ہے۔ مگر کوئی شاہ ولی اللہ و علما بعد العزیز دہلوی کا رتبہ حاصل نہیں کرتا ہی سوز میں ہیں لیکن کوئی فضل حق و محمد الحسن پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ سلطانی کی کثرت اسکتابوں کی زندانی ہے۔ لیک ہمہ تر باقی بوبہ بسیاں ظالم ہیں۔ پاس ہوس سے تعلیم لڑکی سرگرمی سے جاری ہے۔ واہیات بھی کثرت کیساتھ سلمانوں کی جاتی ہے اور ہزاروں صرف کر کے سند بھی لے لیتا ہے۔ لیکن کوئی ان میں سے علوم مغربی کا وہ سیاہ نہیں ہوتا۔ جسکا ہر ایک سررشتہ چیئر علوم مغربی کے اساتذہ کامل العلم سمجھے جاتے تھے۔ یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کر لینا اور بے ہودگیوں کا علم ہونا چاہیے دیگر ہے۔

وہاں یہ علم کا زور ہے یہاں رسن کا ہے ۔۔۔ یہ دیکھئے کہ فرزند کس کا ہے

پس انھیں وجوہ سے علمائے اسلام کی قوت وذکاوت کو خلافت سے لقب کرا دیا اور خود ان کے دست وبازو ہو کر رہے۔ آج سلطان روم بھی اسی کو اپنے خلیفہ کہے جانے میں اور اس میں وہ فخر سمجھتے ہیں۔

اسوقت اسلام کو احیاء کے دست بڑھے اگر کوئی طاقت بچا سکتی ہے تو وہ سلطان ہی کی ہے۔ اسی لیے علمائے کرام وہ جدید زاد جامعہ عثمانیہ [illegible] اس سلطنت کی خیر خواہی تمام

۱؎ مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی متوفی ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۱ء۔ ۲؎ متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء۔ ۳؎ متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء

مسلمانوں کیلئے واجب قرار دیتے ہے۔ اور ان کے بقا و نصرت کی دعائیں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد الحرام میں فرماتے رہے۔ علمائے حرمین کا یکی غیر خواہی پر اجماع ہو۔ اے ہندوستان کے تن پرور اور جمعیتی خوت پرست اے عالم نما سودائی خلافت حرمین تمہاری یہ ایک عجب تماشا ہے۔ ؎

پری نمائے کہ راہ دیو در کرشمہ و ناز ۔۔۔ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است[1]

آپ اگر تعصب کر چکے تو یقیناً دنیائے عالم کی آپ کیلئے دعیان علوم کو تسلیم کرنے اور اسکی بابت ابن سکندر لی دیسیر فی کی مہاب ہوگی۔ شوق و تعصبی آپ بھی ایسے سودائیوں کی کرتوتوں سے گھبرا دیجئے۔ اور ابن مصنوعی پرہیزگاری پر لعنت بھیجئے ؎

چناں کہ گیسو عنبریں و لون ارزق عام[2] ۔۔۔ بہاد و قلاقلی نمیرس کہ شرک تعویذ باطل

اب یہی بات کہ ذکر میں ہو رہی ہے۔ الحاد و دہریت ہے۔ جو ہر ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کہ شدید ہے۔ جاہل مسلمان ہی کے انصاف پر چھوڑتے ہیں۔ ہاں ذرق ہفتہ پر کہ یہاں خلوص کے ساتھ بیدلی اور دل و دماغ سے کوشش کیجائے تو دنیا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ دیکھئے غیروں کے عیب و ہنر

پیش بینی ہے اپنے کہ بہ نظر تو کھا میں کوئی ہنر نہ دیدہ

اسی کوئی ملک میں کہ یورپ کی سوسم تہذیب ہے ذکوں میں آتی ہے دین میں قناعت و تقویٰ سے ہونے لگا ہے کہ تجربہ تک ہو رہے ہیں جب تک خدا کا خوف ان پر غالب رہا۔ دنیا ان کی ہیبت سے کانپتی رہی جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ان کے حکام کی طلبت ان کے دلوں میں تھی۔ اسوقت تک انکی دولت و حیرت دنیا کی اکتساب علوم میں تھی اور جب یہ خشیت کی رداء سے بیگانہ اور تہذیب یورپ سے بیگانہ ہوئے پھر وہ کیفیتم پیچھے ہی پڑتے گئے۔ یہاں تک کہ غیر مسیحی کے کنارے پر آتے ہیں۔ اگر اب بھی بیدار ہو گئے تو پھر دنیا ان کی مطیع ہو۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ آپ سے کنارہ کش ہو کر مسلمان یک چشمی

---

[1] (خواجہ حافظ شیرازی) پری نے منہ چھپایا اور دیو کر شمہ و ناز دکھا رہا ہے۔ حیرت سے عقل جل گئی کہ یہ کیا بوالعجبی ہے۔

[2] اٹھ تاکر بس و ق ارزق عام یعنی نیلے رنگ کے خرقہ کو ایک طرف رکھ دیں،

ترقی نہیں کر سکتے اور بفرضِ محال سلام سے الگ ہو کر اگر مہذب اقلیم کے سلطان بھی ہو گئے تو کیا ہوگا
لعنت ہو اُس سلطنت و عزت پر جو اسلام سے الگ ہو کر ملتی ہو اور ملعون ہو وہ زندگی جو اسلامی ایمان
اُصول پر نہ ہو۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ وَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ رضیت باللہ ربّاً وبالاسلام دیناً
وبمحمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبیاً ورسولاً۔ دیکھو سلطان عبدالحمید خان کا زمانہ ہے۔ اس سلطان کے عہد میں
وہ کچھ پیدا ہوتی ہے اور یورپ کی جھجکتی و جھکتی تہذیب معاشرت سے فرنگیت پیدا کھاتی ہے۔ یہ امر
فتح یورپ و شکستِ ترکی کا دیباچہ و مقدمہ ہوتا ہے۔ اہلِ یورپ جب کسی مُلک کو اپنے زیرِ نگیں لانا چاہتی ہیں
تو پہلے وہ بے باشندہ دشمن مراسم برہم کرانے اخلاق و عصبیت کو فتح کرنا چاہتی ہیں۔ جب اس کی سیاسی ہوا تو
اور اخلاق و معاشرت بالکل تباہ و برباد ہو جاتی ہے تو اس طرح اُس ملک کی تمام دولت سمٹ کر یورپ پہونچ
جاتی ہے۔ تنگ مفلس بھوکے ننگے اہلِ ملک اخلاقی و معاشرتی زندگی میں یورپ کے دلدادہ ہو گئے تو پھر وہ ملک نہایت
سہولت سے تسخیر ہو جاتا ہے۔ ملک کو فتح کر لینا اُسقدر آسان نہیں جیسا کہ اخلاق و عصبیت کا فتح کرنا اہم و دشوار ہے۔
فاتح قوم اگر اخلاق و معاشرت میں مفتوح سے پست ہوتی ہے تو نتیجہ اسکا یہ ہوتا ہے کہ ملک کا فاتح اخلاق و
معاشرت میں مفتوح قوم سے شکست کھا جاتا ہے اور دو تین پشت و ایک نسل کے بعد فرق فاتح و مفتوح ملحوظ و نگاہ
سے مٹ جاتا ہے جیسا کہ تاتاری حکمرانوں کو تباہ و برباد کر کے فاتحانہ حیثیت سے وہاں داخل ہوئے تو عربی اخلاق و
معاشرت نے انہیں مسخ کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتح قوم خود سلطان ہو کر اسلام کی خادم ہو گئی۔ لیکن جبکہ
ملک سے پہلے اخلاق و معاشرت و عصبیت فتح ہو چکے ہوں تو پھر اسکے فتح کی کیا صورت ہے۔
اسی لحاظ سے یورپ نے پہلے ترکی کی رسم و عادت اخلاق آہستہ آہستہ مسخ کرنا شروع کیا اپنی دوستی ظاہر
کی بڑی باتوں نے اپنی خیر خواہی کا یقین دلایا۔ اور بہت سے بنا کر اور سرسبز و شاداب مقامات اپنے ہاتھ میں
بطور ٹھیکے کے لے لیے۔ اسوقت جس قطعہ زمین کا لاکھ روپیہ سالانہ یورپ سلطان کو دیتا ہے۔ اُسکی آمدنی
پچاس ہزار یومیہ ہے۔ جو ملک کہ ٹھیکے پر دیا گیا انجام اسکا ہاتھ سے نکل جانا ہوتا ہے۔ اور پھر ٹھیکہ بھی
دس بیس برس کا نہیں بلکہ سو سو برس کا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ایک بڑا حصہ ملک کی آمدنی کا
تو اسطرح ٹھیکے کی بدولت تباہ و برباد ہوا۔ اب اُس حصے ملک کو دیکھیے جو ٹھیکے پر نہیں ہیں بلکہ انکا

لہ سلطان عبدالحمید خان ثانی (۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء تا ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء)

قلمرو عثمانیہ دولت یورپ کی دسیسہ کاریوں کے آماجگاہ بننے کی وجہ سے ملک کی حالت نہایت مضطرب
تھی کیونکہ دول یورپ انصاری کی حمایت کے بہانے مداخلت کر رہی تھیں۔ مجاز ریلوے کا کارنامہ

انتظام خود متنظمانِ سلطانی کے سپرد ہے۔ اُن ممالک میں نہ تجارت ہے نہ زراعت ہے نہ صنعت و حرفت ہے اور یہی چیزیں ہیں جنسے ملک کی آبادی و دولت کی افزونی ہوتی ہے اور جو سلطنت زیادہ مالدار ہے وہی مضبوط و قوی ہے۔ خاصکر ایسی ممالک میں قوۃ و طاقت مال کا مُرادف ہو گیا ہے۔ اِسلئے کہ بہادر اشخاص درکار ہیں نہ اشخاص میں بہادری کی ضرورت ہے۔ میدانِ جنگ میں فقط روپے کی ضرورت ہے جو سلطنت خوب روپیہ صرف کر سکتی ہے۔ فتح کا نقارہ اُسکے نام بجتا ہے۔ اب جبکہ سلطنت ترکی بے زر ہے تو یقیناً میدان میں اُسے شکست پانا ہے۔ خرچ کے ابواب بند کئے ہوئے ہیں اور آمدنی کے فراخ دروازے بند تو پھر مفلس نہ ہو تو کیا ہو۔ علم الاقتصاد کا مسئلہ اس امر کا مقتضی ہے کہ مشرق باعتبار مغرب کے مستمول و زری ثروت ہو۔ اِسلئے کہ جو ملک اپنے ضروریات زندگی آپ پیدا کرتا ہے وہ دولتمند ہوتا ہے لیکن یہاں معاملہ بالعکس ہے اور بیصرف اسوجہ سے کہ یورپ نے تجارت و صنعت کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور اہالیانِ مشرق ایسی تن آسانی میں مبتلا ہو گئے کہ صنعت و تجارت کے نام سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ لامحالہ اسکا یہی نتیجہ ہے کہ یورپ مالا مال ہو جائے۔ اور ایشیا مفلس و قلاش۔ تحریر سلطانی میں عراق و شام وہ سرسبز و شاداب خطہ ہے کہ زمین تھوڑی محنت سے سونا اُگلتی ہے مگر سلطنت کی کوئی توجہ اسکی جانب نہیں۔ ترکی تجارت کی یہ حالت۔ کہ یہ اپنے روزمرہ کی ضروری چیزوں میں بھی یورپ ہی کے محتاج ہیں۔ بازاروں میں جائیے ہر بلاد مغرب کی ساختہ چیزیں آپکو دکھلائی دینگی۔ لیکن مقبوضاتِ سلطانی کی طیار شدہ چیزیں بطور تبرک بھی دستیاب نہ ہونگی۔ انتہا یہ کہ ترکی ٹوپیاں تک اٹلی، آسٹریا، لندن وغیرہ کی بنی ہوئی آتی ہیں اور کروڑوں کی ہر سال صرف مسلمانوں ہی کے ہاتھوں فروخت ہوتی ہیں۔ صنعت و حرفت میں اسقدر پیچھے ہیں کہ اشیاء کا ایجاد و اختراع تو ایک بڑی بات ہے۔ کوئی ایسا کارخانہ بھی نہیں جہاں دوسروں کی ایجاد کردہ چیزیں بقدر اپنی ضرورت کے طیار ہو جاتی ہوں۔ کارتوس جیسی معمولی و ضروری چیز بھی سلطنت میں طیار نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی عیسائی تاجروں سے لیا کرتے ہیں۔ جسکا ادنےٰ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنگِ بلقان میں کارتوسوں میں بجائے چھرّی کے لکڑیاں نکلیں۔ اسلامی اخلاق اسلامی تہذیب پہلے ہی مفتوح ہو چکے تھے اب ملک فتح کر لیا

اگر آپ غور فرمائیں گے اور انصاف سے کام لیں گے تو سیاسی پہلو کو منصف اسلامی کر دہی کا مسئلہ
بہت کا۔ بین گرتکوں میں ویسا ہی جوش و دینی غیرت جیسا کہ منتقدانے اسلام پر موجود ہے
تو آج اس سلسلہ کے اُنھیں دشمن نہ بنا سکتے۔ یورپ کی بہت سے دانشمند اور مسلمانوں میں کیں
ان کا رکھا۔ وہ دُور ماندہ میں اسلامی شان آتی رہی۔ یورپ کی لڑائی بڑی بڑی ہوتی پڑا اور اُسکے
بعض کو چھوڑ بیٹھا وہ اسلام کے منہوم سے محض آشنا۔ باپ کی شکل وصورت اسلامی
نہیں۔ گھر میں شریعت کا عمل نہیں۔ مکان میں عبادت و ہیئت۔ پھر اب پر مجید مسلمان ہیں
ہو تو کہ ہے۔ صرف ترکی کیپ چھوڑ دیجئے سے اسلامی جوش نہیں ہوتا ہے۔ والوں کی تعلیم
بہت سے گئے ہیں گراں باپ میں دینداری پیدا نہیں وہ بھی جوان ہو کر دین سے
لاپتہ ہو گا۔ اور جب تک مذہب کا بنیاد نہ ہو گا اسلامی خلافت میں سرگرمی نہ ہو گی۔

سلطنت ترکی کی بہت سی اسباب سیاسی و مذہبی اس وجہ سے بڑھ گئے تھے کہ مسلمان
کھو گئیں۔ لیکن یہ معلوم ہو کہ سلطنت ترکی سے اسلامی وجہ دی و مسلمانوں کے لیے
یہ خوش کن کہ رہا ہے وہ ترکوں کے احوال سے محض ناواقف ہیں۔ اور اُسکی بہبودی
واقعیت کے باعث نہیں۔ بلکہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں اور اُسکے علوم کے ذرائع زنانہ اہل
وثوق ہیں۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اُن کے حقوق نہ اسلوش میں کیے جاتے
بلکہ ہی وہ بائیں ہیں جو اور بھی اُنھوں نے بہبودی پر مسلمانوں کو آمادہ کرتی ہیں۔

بھائیو! کیسے کہ مگر آپ کا بھائی یا فرزند مریض ہو اور ہر طرح سے
اُسے بد پرہیز ہی کر رہا ہو۔ طبیب کی ہدایت پر کاربند نہ ہوتا ہو۔ تو آپ ایسی حالت
میں اپنے اُس کنبہ جگر فرزند۔ یا تو بہ باز بھائی کو نصیحت فرمائیں گے۔ اور
خود اُس کے پرہیز و دوا میں زیادہ سرگرم ہوں گے۔ یا زہر کا پیالہ پی لیں گے
اگر کسی بات سے اپنے کو یا بھائی نے اپنے بھائی کو اُسکے مرض بادہ پرستی سے
بچا کر زہر پلا دیا ہو۔ تو آپ بھی سلطنت ترکی کو ویسا ہی سمجھ کر اُسکا زہر ہلاہل پلا دیجئے

میں نہیں ہو سکتا کہ دل میں ذرہ برابر بھی اسلام کا درد ہو گا وہ ایسے انحطاط کے سبب ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے تباہی اسلام کا تماشا دیکھتا رہ جائے جس دل میں خدا اور اللہ تمہارا کا خوف اور اس ذات نوازِ پیغمبر کی محبت ہو اُسے سکون و اطمینان کیونکر ہو گا۔ جنیں کو بھی چیا خیریت ہو گی وہ ان واقعات کا لکھنے کیونکر بیداری حاصل نہ کر سکے۔

اگر بفرضِ محال اسوقت بھی مسلمانوں نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو پھر کوئی اُمید ان کی نہیں کی جا سکتی سنئے سے پیشتر بہت سے حالات و واقع میں آیا کیونکہ ان میں کوئی ایسا نہ تھا جبکا اثر اتنا دیر پا تک رہتا۔ یہ سلطنت اسلامی اُسوقت سے ہٹ رہی ہے۔ جبکہ عام طور سے مسلمانوں سے تن راحت ہو چکا ہے۔ اور کوئی طاقت کسی قسم کی کہیں بھی منسوب نہیں ہی ہے کیونکہ حکومت جلد اپنے فرائض کو نہایت سرگرمی سے سرانجام دیا جائے۔ اسوقت پانچ امور پیش نظر ہیں۔ مسلمین ثابت قدم رہیں اور کاربند ہونے کی کوشش۔ اور اگر یہ تمام عرض اثبات فقیر کی نہیں کی انہیں بلکہ اس بلاشک و بلاشبہ معلوم ہو۔ تو وہی کا تو کر پاس ہی ہو گا اس کے حوالہ دیں کیجئے اس پر کوئی شکایت نہیں۔ ؎

ہمہ ہی نہ مہ راہ خویش گیرد و بد
ترا سعادت باد ہر آنچہ او ہی

اب میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں اُن امورات ضمنی کا مجملاً ذکر کرتا ہوں۔

اوّلاً نہایت ہی اہم بہت ہی ضروری امر ہے کہ عرب کی قوم اسوقت بیدار کیجائے بڑی زبردست قوم۔ بہت غیور قوم۔ کامل شجاع و جانباز قوم عربوں کی موجود ہے۔ مملکت اسلام نے انہیں اور ان کے پیش رہا قابلیتوں کو مستور و خاص کر رکھا ہے۔ خلفائے عباسیہ کے عہد سے یہ قوم برابر سوئی جا رہی ہے کل عثمان نے بھی خدا کی اس نعمت کو نگاہ استحسان و قدر سے نہ دیکھا۔ بلکہ خلافت سلطنت کے خیال سے ان کے جذبات خبر اور ہی عربوں پر تیز ہو گئی۔ اور اب اسوقت یہ قوم بیان تک خفتہ و خستہ ہو گئی ہے۔ کہ کسی کو خیال ہی ان کی اصلاح کی طرف

ف تو شیر ہمراہی نہیں ہے تو اپنی راہ لے تجھے سعادت و نیک بختی مبارک ہو اور مجھے تو ساری دنیا بخشی۔

مائل نہیں ہوتا۔ انسوس۔ ؎

میساہی یہاں تک تیری رفتار نے ظالم
آندھی سے میری خاک اڑائی نہیں جاتی

اگر سلطنت کی جانب سے کچھ بھی ان کے اسباب تعلیم میں سہولت پیدا کیجاتی۔ تو آج سلطنت ترکی۔ علوم و فنون کا مرکز ہوتی۔ اگر آل عثمان اسطح حیات پر انہیں استاد خل بھی دیتے۔ گو فوج میں ایک رسالہ شجاعانِ عرب کا بھی ہوتا۔ تو آج جیسائیوں کو لڑتے ہوئے دانتوں سے پسینہ آجاتا۔ خیر ماضی ماضی۔ اسوقت مصلحین اُمت کا فرض ہے کہ بلاد عرب کا دورہ کریں اور اس امر کو غور کریں۔ کہ کس خطۂ عرب میں کس نوعیت فن کا دارالعلوم قایم ہونا چاہئے دمشق، بغداد، طرابلس، بخد، یمن، مکہ، مدینہ، ان تمام جگہوں میں مدارس قایم ہوں۔ مثلاً مکہ و مدینہ، ان تمام جگہوں میں دارالعلوم قایم کئے جائیں۔ طائف میں صنعت و حرفت کا مدرسہ کھولا جائے۔ طرابلس و نجد میں سائنس کی تعلیم گاہ قایم کیجائے۔ غرض جس جگہ جس طرح کی تعلیم زائد مفید و مؤثر ثابت ہو وہاں اسی کے ماہرین جمع کئے جائیں۔ اور تعلیم کا سلسلہ شروع کردیا جائے علمائے ربانی اور قبائل کے شیوخ کا یہ فرض ہے کہ ان اقعات سے خود بھی بیدار ہوں اور تمام عربوں کو اناالذین یالعربیان کہکر نہایت سرگرمی و اخلاص و دلسوزی و ایثار سے بیدار کریں۔ ورنہ اگر اسوقت فرصت برابر بھی تن آسانی اختیار کی گئی۔ تو دشمن اپنے تدلیس و تلبیس کے جال میں ان شہبازوں کو اسیر کرلے گا۔ اور پھر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ عربوں کو خوب سمجھا دینا چاہئے۔ کہ دشمن کے تملق پر فریفتہ نہوں اس کے ہاتھ میں شربت کا پیالہ نہیں ہے بلکہ زہر قاتل ہے۔ جس کا ذائقہ شکر سے مبدل کردیا گیا ہے انکی نعمتوں کو لات مارو۔ اور اپنے فقر پر قانع رہکر سعی و کوشش کے قوی کو جنبش دو ؎

پائے در زنجیر پیش دوستاں
بہ کہ بابے گلخناں در بوستاں [1]

---

[1] دوستوں کے پاس ہوتے ہوئے اگر پاؤں میں زنجیریں بھی پڑی ہوں تو اس سے بہتر ہے کہ بیگانوں اور اجنبیوں کے ساتھ باغ کی سیر کریں۔ (کلام شیخ سعدی شیرازیؒ)
[2] میں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں،

یاد رکھئے اگر یہ عرب بیدار ہو گئے۔ تو پھر ان کا پُرجوش مستانہ نعرۂ اللہ اکبر تمام خوابیدہ مسلمانوں کو جگا دیگا۔ اسلام عربوں ہی کے ہاتھوں پھیلا ہے اور اس وقت بھی انہیں کی ہمت بازو۔ اس گرتے ہوئے ایوان کو تھام سکتا ہے ؎

خیز تا از در میخانہ کشادے طلبیم
بر در دوست نشینیم و مرادے طلبیم [1]

ثانیاً یہ گزارش ہے کہ اس زمانے میں جبکہ اور قومیں مٹی سے سونا پیدا کر رہی ہیں ہم اشرفیوں کو خاک میں ملا رہے ہیں۔ ایام حج میں حجاج جو قربانیاں کرتے ہیں۔ اُن کا کوئی مصرف بجز اس کے نہیں ہوتا کہ مذبوح جانور (جس میں اونٹ بھیڑ بکری گائے ہوتی ہیں) خاک میں دفن کر دیئے جائیں۔ غور کرنکی بات ہے لاکھوں کی تعداد میں قربانیاں دی جاتی ہیں جنکے پوست و گوشت و استخوان کی قیمت ایک کافی دولت کہی جا سکتی ہے۔ وہ اس طرح مٹی میں ڈال کر خاک بند کیجاتی ہے کاش مسلمانوں کی ایک جماعت سلطان سے اجازت طلب کرکے وہاں کسی مناسب مقام پر ایک کارخانہ جاری کرے۔ جسمیں یہ تمام مذبوح جانور پہنچ جائیں۔ اور اُن کے گوشت کو خشک کرکے ڈبوں میں بند کیا جائے۔ اور چمڑے کی دباغت کرکے چمڑی اشیاء تیار کیجائیں یہ خشک گوشت اور وہاں کا چمڑی چیزیں جس جگہ مسلمانوں کو مینگنی وہ بطور تبرک کے مفرد بینگ اسلام کروڑوں روپے کی آمدنی ہوتی جاتی ہے اگر دوسرے ملک کا باشندہ اس کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ یا ازروئے شریعت اس سے نفع نہیں اُٹھا سکتا۔ تو خود سلطان کو اس کی طرف توجہ دلائی جائے۔ تاکہ ایسا انتظام کرکے اس کی آمدنی سے مدارس دینی اپنے تمام حدود سلطنت میں قایم کریں۔

ثالثاً یہ التماس ہے کہ ایام حج جسمیں تقریباً ہر ملک کے مسلمان جمع ہوتے ہیں اور اُن ایام متبرکہ میں اُس پاک سرزمین پر پہنچ کر ایک سچا اخلاص محبت الٰہی کا جوش تمام حجاج کے دلوں میں ہوتا ہے۔ ہم اُن جمعیت و جذبات الٰہیہ سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ نہ ایک ملک کا باشندہ

---

[1] (خواجہ حافظ شیرازی رح) اُٹھ تاکہ شراب خانہ کے دروازے سے کچھ کشادگی چاہیں درِ دوست پر بیٹھیں اور کوئی مراد مانگیں۔

دوسرے ملک کے باشندے سے ملکر اُس کے احوال و خیالات سے آگاہ ہوتا ہے نہ علما باہم ملکر اصلاح اُمت کی کوئی تدبیر قرار دیتے ہیں کسیطرح کی کوئی عام تحریک وہاں ایسی نہیں کیجاتی جس سے مسلمانوں کو دین کے ساتھ شغف پیدا ہو۔ اور اُن کے ایمانی جذبات کو حرکت ہو یہ علم الابدان جمع وہاں سے محبوس و تسبیح و مسواک لیکر واپس آتا ہے اور اسیکو دلیل علمیت اس مقدس سفر کی سمجھتا ہے حالانکہ اس حیثیت میں جو طبقہ سیاسی مضمر ہے اُسے ارباب فہم و ذکا خوب سمجھتے ہیں لہذا اعلما و مشائخ کا یہ فرض ہے کہ اُس جگہ جو کہ مرکز اسلام ہے اور جہاں سے اسلام کا دریا رواں ہوا۔ ایام حج میں حمیت اسلامی کا ایسا جوش وہاں پر پھیلائیں۔ کہ غفلت و ہوا و ہوس کے وسوسے بجھ کر خاک ہو جائیں اور حجاج کا ظاہر و باطن اتباع سنت سے ایسا آراستہ ہو جائے کہ وطن پہنچکر انکی صورتی و معنوی یکرنگی دیگر ابنائے وطن کو بھی اُسی توحید کے رنگ میں رنگ ڈالے ؎

بیرون[1] در دنِ من خود صورتِ او پیدا
در حضرتِ کفرستان بتخانہ چنیں باید

رابعاً یہ عرض ہے کہ ہر مسلمان اپنی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ سالانہ خدمات اسلامی کیلئے نکالا کرے اور ایک جگہ تجویز کر لیجائے جہاں سب کے مرسلہ روپے جمع ہوا کریں۔ پھر ایک جماعت نہ دار امنا[2] کی مقرر کیجائے۔ اور اُس روپے میں سے ایک معتد بہ رقم سالانہ سلطان کیخدمت میں مصارف حرمین کے لیے بھیجی جاوے۔ تاکہ سلطان کو کسیقدر مصارف حرمین سے فراغ ہو۔ اور وہ اپنے مما حصل کو اپنے سیاسی و ملکی ضرورتوں میں صرف کر سکے نیز اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کے وقت جو مسلمانوں کو ملک کے سامنے ہاتھ پھیلانیکی حاجت ہوتی ہے اس میں بہت کچھ کمی ہو جائیگی۔

یہ روپیہ کس جگہ جمع ہوں اور اُس کے امین کن اوصاف کے ہوں خرچ کے کیا قواعد وضو لابد قرار دیے جائیں اسے ارباب حل و عقد خود فیصلہ کر لیں چاہے ہر شہر میں الگ الگ قایم کریں چاہے باعتبار ضلع و صوبہ اس کا قیام تجویز فرمائیں۔ مگر یہ سلسلہ شروع کر دیں

---

[1] زائران کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں ؟
[2] میرے ظاہر اور باطن سے خود اس کی صورت ظاہر ہو رہی ہے اور کفرستان کی درگاہ میں اسی طرح کا بت خانہ ہونا چاہیے۔ [3] اُمنا۔ امین کی جمع، امانت دار

اور جلد سے جلد اس کے لیے مستعد ہو جائیں ؏

اے زرفرصت بیخبر در ہر چہ باشی زود باش [1]

پانچویں بات سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ وہ ہر بلاد کے مسلمانوں کی دینداران زندگی ہے۔ اس کے لیے علما کا باہم ایک تعلق قایم ہونا چاہیے جس طرح سلاطین کے متعدد ایک دوسرے کی سلطنتوں میں مقیم رہا کرتے ہیں اسیطرح چند علما جو شیخ الاسلام کے نائب ہوں ہند و افغانستان وغیرہ میں اقامت اختیار کر لیں تاکہ باہمی جمعیت و مشورہ سے دینداری کا اثر مسلمانوں میں پیدا کر لیں۔ نیز اس امر کی طرف سلطان کی توجہ بھی اسوقت ہوگی جبکہ ہر بلاد العصد کے علما متفقہ قوت سے کسی امر شرعی کی تر پیچ پر زور دینگے۔ اس لیے کہ تدین ہی وہ خصوصیت ہے جو مسلمانوں کو تمام اقوام دنیا سے ہر حال میں ممتاز و برگزیدہ خلق رکھتی ہے۔ اقبال فجاہ میں شکر کا جامہ ان پر ہوتا ہے اور فقر و فاقہ میں صبر و رضا کا خلعت۔ چند روزہ زندگی چاہے فانی لذات دینے والے تعیش سے آشنا ہو یا نہو لیکن ذکر الٰہی کی لذت سے روح دائمی سرور ضرور حاصل کرے گی ؎ [2]

اے ذکر تُرا ہر دم و در دل اثر دیگر
دے از تو بہ کالبد جاں ہر دم خبر دیگر

ہماری مذہبی حالت اس طرح تباہ و برباد ہو گئی ہے کہ اگر ہمارے اسلاف اپنے قبروں سے نکلکر ہماری کیفیتوں کا نظارہ کریں تو واللہ انہیں سیطرح ہمارے اسلام کا وہم بھی نہو۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلمانوں کا نصب العین دین و ایمان تھا اور کامرانی دنیا ایک طفیلی شے۔ اب دنیا اصل مطلوب اور دین ایک مرفضول۔ کسیوقت دولتمندی کا شمار اعمال حسنہ و اخلاق سنیہ پر تھا اب درہم و دینار کی تھیلیوں پر۔

افسوس اسلام کیا تھا اور ہم نے کیا بنا رکھا ہے۔ نہیں معلوم کل مرنے کے بعد جب حضوری اس جلیل و جبار کی ہوگی تو کیا منہ لیکر ہم جائینگے معاصی کی سیاہی چہرہ پر چڑھی ہوگی

[1] اے تو جو کہ فرصت سے بے خبر ہے جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے جلدی کر لے کہ پھر یہ موقع ملے یا نہ ملے۔ [2] تیرے ذکر سے ہر لحظہ دل پر ایک نیا اثر ہوتا ہے اور اس سے جان کے ملک کو ہر وقت دوسری خبر ملتی ہے۔

اور نافرمانی کا ذلیل طوق گلے میں ہو گا۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ اس رحمن و رحیم نے اپنے کمال فضل و رافت سے ہمیں بتا کر بھیجا دیا تھا وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کا کہ دیکھو ہوشیار خبردار میری اطاعت کی رسّی گلے سے نکلنے نہ پائے میرے سرکار میں جو آتا تو مسلمان آتا مگر ہم اپنے تخیلات فاسدہ میں ایسے مبتلا ہوئے کہ یہ تمام باتیں ہمیں فسانہ معلوم ہونے لگیں اور شیطان نے یہ افسوں کان میں پھونک دیا کہ ؎

واعظ ناداں کی باتوں پر کوئی جاتا ہے بہکے
آؤ میخانہ چلیں تم کس کی باتوں پر گئے

علاوہ بیدار ہو کر کوئی ایک جانس بھی زندگی کی لے سکتا ہے یہ سب دھکوسلے ہیں صرف نکاح و خطبہ اور ایسی ایسی باتیں مذہب بتلاتا ہے اور اسمیں دھرا کیا ہے۔ اس ترقی کے دور میں جبتک مذہب کے دام سے نہ نکلو گے آزاد انہ حیات کے لطف نہ پاؤ گے نہ تمہیں آئیگا نہ پولیٹکس سے کوئی حصہ ملیگا ایک مقید نا مہذب زندگی ہو گی جسمیں سراسر تقیید و درشت کے بند ہونگے لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم حالانکہ اگر حقیقت میں نگاہوں سے دیکھا جائے نفس الامر میں مہذب و آزاد زندگی انہیں کی ہو سکتی ہے جنھوں نے نہایت مچائی سے اللہ و رسول کی اطاعت کی زنجیر نفس مادہ کے قدموں میں ڈالی ہو ؎

خلاص حافظ از ان زلف تا بدار مباد
کہ بستگان کمند تو رستگار انند

پس اسوقت ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے نفس کا آپ محاسب ہو جائے اور ترک معاصی پر شدت سے مستعد ہو علما اپنی پند و نصائح سے مسلمانوں کو گرماتے رہیں اور اپنی باعظمت زندگی کو ایک سچا اور باہمرہ وعظ بنائیں اسلح اگر دینداری کی طرف کچھ عوام پڑے ہے اور علمائے اپنی مخلصانہ تحریر و تقریر اور بھی زیادہ یعنی عملی زندگی کے نمونے مسلمانوں کو بڑھانے کی کوشش کی تو ان شاء اللہ العزیز بعجلت جلد خدا کی رحمت نہیں سبقت میں اپنے فضل سے کامیاب

ہو گے ہی آزادیں۔

لے جائے رب ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت فرمائی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما بیشک تو ہی بہت عطا فرمانے والا ہے۔ (آل عمران ۸ ع سورۃ بقرۃ ۳۲ آل عمران ۱۰۲ ع اخواجہ حافظ شیرازی) اس پر مرے زلف کے خدا کے حافظ کا چھٹکارا نہ ہو اس لیے کہ تیری کمند سے بند ہے

بنادیگی۔

عزیزو ہوشیار ہوشیار۔ دین کی دولت ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ اس شاہانہ زندگی سے جو کہ بمیساتھ میسر آتی ہزار درجہ وہ عسرت کی زندگی محبوب ہے جسمیں چاشنی ایمان کی اور سوزش عشق الٰہی کی ہو ؎

دود آہ سینۂ سوزان من
سوخت این افسردگان خام را

اسوقت ترکی کے چندہ کی جو رفتار کہ وہ بہی ہے اور اس مصیبت کا ایسا احساس نہوا جیسا کہ ہونا چاہئے تھا یا چندے وصول شدہ بے کم و کاست نہ پہنچے یہ سب نتیجہ ہماری دین سے غفلت کا ہے۔ اگر ہمیں دین کی محبت ہوتی تو نوبر آمعتمد و دیانتدار اہل دول اہل الرائے ایک صدر کمیٹی مقرر کرتے اور اس کے شعبے جا بجا ہندوستان میں پھیل جاتے۔ تمام رئیس معتبر میں جمع ہوتیں اور وہاں سے بہت ہی احوط طور ایجنسی سے روپیہ ترکی کو بھیجا جاتا۔ اسلئے روپیہ بھی ایک کافی مقدار میں جمع ہوجاتا اور بے حیاؤں کی خورد برد سے رقم بھی محفوظ رہتی۔

خیر ہنوز دروازہ توبہ کا کشادہ ہے اور خدا کی رحمت اب بھی لبیک کہنے کو موجود ہے۔ ؎

باز آ باز آ و ہر آنچہ ہستی باز آ ؛ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
این درگہ ما درگہ نومیدی نیست ؛ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ[1]

واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی من ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شئی علیم وعلی آلہ وصحبہ واولیاء امتہ اجمعین وعلینا معھم یا ارحم الراحمین ۰

حررہ بقلمہ
فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہ
البہاری المیروادی

[1] (خواجہ حافظ شیرازیؒ) میرے جلتے ہوئے سینے سے نکلنے والی آہوں کے دھوئیں نے ان کچے ٹھٹھرے ہوؤں کو جلا ڈالا۔ [2] ابوسعید ابوالخیرؒ کی رباعی ہے۔ واپس آجا واپس آجا تو جو کچھ بھی ہے واپس آ جا اگر کافر ہے آتش پرست ہے،

ہمارا پتہ ۱۴۰۵ء

بت پرست ہے تو جو کچھ بھی ہے واپس آجا۔ یہ ہماری درگاہ جسمیں نا امیدی ناداری کی درگاہ نہیں ہے اگرچہ تو سیکڑوں بار توبہ شکنی کر چکا ہے پھر بھی واپس آجا۔

تاریخ وفات

۲۶، اپریل ۱۹۳۹ء
مطابق ۵، ربیع الاوّل
۱۳۵۸ھ

۷۸۶
۹۲

"چراغ مجلس شیرخ حبیب"

۱۹۳۹ء

ملک معنی کا سلیماں، خسرو اقلیم فقر — تاجدار کشور تعلیم و عرفاں وہ ہُدا
عبرت اسلام کا پیکر، نشانِ اوجِ حق — مصلحت کیشی سے کوسوں دور وہ مردِ خدا
حق حفاظت میں جس کی تھی تقدیرِ رجلِ عظیم — اللہ اللہ وہ محاسن کی شبیہِ خوشنما
مظہرِ اوجِ امامِ اہلِ سنّت بالیقیں — اُس کا اجلال و حشم اُس کا شکوہ و طنطنہ

دو تواریخ وصال اُس مردِ کامل کی کہیں

"سبیل انوارِ رضا"
۱۳۵۹ھ

"خورشیدِ اوجِ مصطفیٰ"
۱۳۵۹ھ

(شکریہ ظہور الحق صاحب کا نوٹ)

(ڈائری نویس ظہور الحق صاحب)
۵، مارچ ۱۹۳۹ء

پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق
اُن کے ہم عصر اکابر اور دوسرے مشاہیر کی آراء

علامہ محمد اقبال: پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب المعین میں عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔

سید سلیمان ندوی: ساری عمر علی گڑھ میں گزری، جہاں امراء اور ارباب جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا، مگر اُنہوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ اُن میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے، جس سے ملے برابری سے ملے اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر۔ علی گڑھ کے عشرت خانہ میں اُن کی قیام گاہ ایک درویش کی خانقاہ تھی، یہاں جو آتا، جھک کر آتا۔ اگر مجلس ساز گار ہوئی تو دعائیں لے کر گیا، ورنہ اُلٹے پاؤں ایسا واپس آیا کہ پھر اُدھر کا رُخ نہ کیا۔

تحریر و تالیف کا بھی ذوق تھا۔ خسرو کی ایک مثنوی پر مقدمہ لکھا ہے۔ حج کے مسائل اور عربی کے فضائل پر دو رسالے لکھے ہیں، ایک کتاب المعین نام عربی فیلالوجی پر لکھی تھی، جس پر ہندوستانی اکیڈمی نے انعام دیا تھا۔

خواجہ حسن نظامی: علی گڑھ کالج میں دینیات کے پروفیسر ہیں، صوفیانہ مشرب رکھتے ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تقریر ایسی تیز اور مسلسل کرتے ہیں جیسے ای-آئی-آر کی ڈاک گاڑی۔ دورانِ تقریر صرف درود (شریف) پڑھنے کے لئے تھوڑی تھوڑی دیر میں وقفہ ہوتا ہے، ورنہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمالہ کی چوٹی سے گنگا کی دھار نکلی ہے جو ہردوار تک کہیں رُکے اور ٹھہرنے کا نام نہیں لے گی۔ بیان کی ایسی روانی آج کل ہندوستان کے کسی عالم میں نہیں ہے۔ تقریر میں محض الفاظ ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر فقرے میں دلیل اور علمیت کا انداز ہوتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ: پروفیسر صاحب مرحوم کی شخصیت اتنی جامع اور متنوع تھی کہ ہر موضوع اور ہر موقع سے بکمال حُسن و خوبی عہدہ برآ ہوتے۔ کوئی کیسا ہی خالی الذہن ان کی صحبت میں جاتا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند لوٹتا جو شاید مدتوں کے مطالعہ یا مشاہدہ سے حاصل نہ ہو سکتے۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی: میں نے بہت سی یونیورسٹیاں دیکھی ہیں، بڑے بڑے علماء کو دیکھا اور قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے، لیکن سلیمان اشرف جیسا عالم میں نے نہیں دیکھا۔ میں جب اقبال کے مردِ مومن کا تصور کرتا ہوں اور اپنے آس پاس اسے تلاش کرتا ہوں تو مولانا سلیمان اشرف کا پاکیزہ اور روشن چہرہ میرے سامنے آجاتا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور: مولانا سید سلیمان اشرف کی شخصیت میں علم کی رئیسانہ شان ہے۔

طالب ہاشمی: حضرت مولانا سید محمد سلیمان اشرف صاحب کا شمار اپنے دور کے سرآمد روزگار علماء میں ہوتا تھا۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اسلامیات کے صدر تھے اور قریب قریب ساری عمر انہوں نے علی گڑھ ہی میں گزار دی، ان کا وجود علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے آیۂ رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ علم و فضل کا بحرِ زخار اور ظاہری و باطنی خوبیوں کا پیکرِ جمیل تھے۔

سید سلیمان اشرف بہاری کا شاہکار سدا بہار

الانہار

مقدمہ

مثنوی حشت بہشت

از: حضرت امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

عربی زبان کی فصاحت و بلاغت، بے مثال فضائل و محاسن اور اقوام عالم کی زبانوں پر سبقت و فوقیت پر روشن دلائل

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

المبین

تحقیقی و تنقیدی تبصرہ

مصنف

علامہ سید سلیمان اشرف بہاری رحمۃ اللہ علیہ

نام نہاد روشن خیالی اور ترقی پسندی کا طوفان یا خیر یا نہیں ۔ تحریک قیام پاکستان کے وقت دو قومی نظریہ کے مقابل صف آرا ہندو راہنماؤں اور گاندھی کے عقیدت مندوں کے مذموم عزائم کا پردہ چاک کرنے والی

عظیم اسکالر، پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ

(سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی تاریخی تالیف

"النور"

آج بھی تاریکیوں سے اجالوں کی طرف راہنمائی کرتی ہے

ادارہ پاکستان شناسی

۲۰-۲۳ سوا صیوال کالونی ملتان روڈ لاہور۔ فون ۷۳۱۲۸۶۳